اِنسانِ کامِل

اُستاد شہید مرتضیٰ مطہری

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

اِنسانِ کامِل

اُستاد شہید مرتضیٰ مطہری

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستا

انسانِ کامل

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

یکے از مطبوعات

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲

022-2785626

لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ

تالیف	آیۃ اللہ شیخ مرتضیٰ مطہری
ترجمہ	محمد فضل حق
اصلاح و نظر	کاظم علی گجراتی
کتابت	اشرف راحت
طباعت	مقصود انجینیرز کراچی

طبع ہفتم ۲۰۰۸ء مطابق ۱۴۲۹ھ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔ یہ کتاب کلی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ ناشر کی پیشگی اجازت حاصل کئے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل، تجارت یا [illegible] عاریۃً کرایہ پر دی جائے گی [illegible] گی۔

اسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّم دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ سید ابوالقاسم موسوی خوئیؒ کا قائم کردہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں متعدد کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوب بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ ادارہ ہٰذا تقریباً ۵۰۰ مدارس و مکاتب میں زیرِ تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

دعوتِ اسلام ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے ہم سب کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جا سکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمدؐ و آل محمدؐ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی

وکیل حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیستانی دام ظلہ العالی

فہرست

کامل اور غیر کامل انسان	۹
اسلام کی رُو سے کامل انسان کو پہچاننے کا معیار	۱۰
کامل سے کیا مُراد ہے ؟	۱۳
اَکْمَلْتُ اور اَنْعَمْتُ میں فرق	۱۴
آفاتِ رُوح	۲۳
مختلف موجُودات کا کمال	۳۶
اِنسان کی ماہیت	۴۷
خُودشناسی خُداشناسی کی تمہید ہے	۱۰۱
انسان کوکس چیز سے نجات چاہیے ؟	۱۱۰

کمال اور اخلاق کا رابطہ ۱۳۸
مکتبِ انتفاع ۱۴۲
کامل انسان اور مختلف نظریات (۱) ۱۷۰
کامل انسان اور مختلف نظریات (۲) ۱۹۳
کامل انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ ۲۲۰
انسان کا فطرت سے رابطہ ۲۳۵
کامل انسان اور مختلف نظریات (۳) ۲۳۶
مختلف مکاتبِ فکر کے نظریات کی تفصیل (۴) ۲۷۴
مختلف مکاتبِ فکر کے نظریات کی تفصیل (۵) ۳۰۲
دنیائے مغرب میں ایثار و محبت ۳۲۰

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب میں 'انسانِ کامل' کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی ۱۱ تقاریر کا مجموعہ ہے جو ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل کی گئی تھیں۔

ان تقاریر میں استاد شہید نے 'انسانِ کامل' کے بارے میں مختلف مکاتبِ فکر کے افکار و نظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے اسلام کے 'انسانِ کامل' کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ آپ نے امام علی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کو اسلام کے انسانِ کامل کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ استاد شہید کی تقاریر کو حرف بہ حرف لکھا جائے، اس لیے آپ کو کہیں کہیں جملہ بندی میں خامی محسوس ہوگی اگرچہ ہم نے بعض جگہ پر باقتضائے ضرورت معنی میں تبدیلی کیے بغیر جملہ بندی میں تبدیلی کی ہے

ادارہ

پہلی نشست

کامل اور غیر کامل انسان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ بَارِئِ الْخَلَائِقِ اَجْمَعِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عَبْدِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَحَبِیْبِہٖ وَصَفِیِّہٖ وَحَافِظِ سِرِّہٖ وَمُبَلِّغِ رِسَالَاتِہٖ سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا وَمَوْلٰنَا اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ الْحَکِیْمُ فِی الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ: وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ.

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ انھوں نے پوری کر دیں تو خدا نے فرمایا: میں تمھیں لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ انھوں نے عرض کیا کہ بارالٰہا! میری ذریت میں سے بھی امام مقرر فرما۔ خدا نے فرمایا کہ میرا یہ عہدہ ستمگروں کو نہیں ملے گا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

ہمارا موضوع بحث ہے اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کامل انسان۔ کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے نمونہ اور ان کے مقابلے میں اعلیٰ اور ارفع ہو۔ اب آپ اسکو جن الفاظ سے بھی چاہیں تعبیر کریں۔ بہت سی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی کامل اور غیر کامل بلکہ معیوب اور

سالم ہوتا ہے یعنی انسان معیوب بھی ہوتے ہیں اور سالم بھی ہوتے ہیں پھر سالم انسان کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) سالم انسان جو کامل ہوتا ہے

(۲) سالم انسان جو غیر کامل ہوتا ہے

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کامل یا مثالی انسان کا پہچاننا ہم مسلمانوں پر اس لیے واجب اور لازم ہے کیونکہ وہ عالم انسانیت کے لیے نمونے اور مثال کا حکم رکھتا یعنی اگر ہم کامل مسلمان بننا چاہیں (کیونکہ اسلام ہمیں کامل انسان بنانا چاہتا ہے) اور اپنے آپ کو انسانی کمال کے درجے تک پہنچانا چاہیں تو فقط اسلامی تعلیم و تربیت کے تحت ہی ممکن ہے۔

چنانچہ ہمیں جاننا چاہیے کہ کامل انسان کیسا ہوتا ہے؟ کامل انسان کا چہرہ (یعنی اس کا روحانی اور معنوی چہرہ) کیسا ہوتا ہے؟ کامل انسان کا معنوی وجود کیسا ہوتا ہے اور کامل انسان کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ —— تاکہ ہم اپنے معاشرے، اپنے افراد اور خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی بنائیں۔ لیکن اگر ہم اسلام کی نظر میں ایک کامل انسان کو نہ پہچانیں تو ہم اسلام کی رو سے قطعاً ایک تمام اور کامل مسلمان یا دوسرے لفظوں میں ایک کامل انسان نہیں بن سکتے، خواہ وہ کاملیت اعتباری ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کی رو سے کامل انسان کو پہچاننے کا معیار

اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کامل انسان کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں قرآن نے اور پھر سنت نے اپنے بیانات میں

کامل انسان کی تعریف کیسے کی ہے۔ اگرچہ قرآن اور سنت میں "کامل انسان" کا نہیں بلکہ "کامل مسلمان" اور "کامل مومن" کا ذکر آیا ہے لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ کامل مسلمان کے معنی ایک ایسے انسان کے ہیں جو اسلام میں کمال کو پہنچا ہو اور کامل مومن سے مراد وہ انسان ہے جو ایمان کی بدولت کمال کو پہنچا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن اور سنت نے کامل انسان کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں اور اس کے چہرے مہرے کے لیے کونسے خطوط کھینچے ہیں۔ حسن اتفاق سے قرآن اور سنت میں اس موضوع پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم انسانوں میں سے معیاری افراد کو پہچانیں اور انہیں اپنے لیے نمونہ بنائیں —— ان افراد کو جن کے بارے میں ہمیں اطمینان ہو کہ وہ درجۂ کمال پر پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسی انداز میں ڈھالا ہے جیسے خدا چاہتا ہے اور جیسے اسلام چاہتا ہے۔ یعنی وہ معیاری شخصیت کے مالک اور کامل انسان بن گئے ہیں۔ اسلام کا مطلوبہ کامل انسان محض ایک تصوراتی، خیالی اور ذہنی انسان نہیں کہ جس کا کوئی ظاہری وجود نہ ہو۔ ایسا اس لیے نہیں کہ بہت سے افراد ایسے گزرے ہیں جو انسانیت کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوئے یا اس سے ایک یا دو درجے نیچے تک پہنچے۔ خود حضرت رسول اکرمؐ اسلام کے کامل انسان کا ایک نمونہ ہیں۔

اور امام علیؑ کامل انسان کا ایک اور نمونہ ہیں۔

اس لیے علیؑ کی پہچان —— اسلام میں کامل انسان کی پہچان ہے لیکن یہ علیؑ کی پہچان ہونی چاہیے (کہ) یہ ان کے نام و نسب سے ان کی رسمی پہچان ہو۔

بعض اوقات ایک انسان علیؑ کو شناختی کارڈ کے اندراجات کی حد تک ہی پہچانتا ہے یعنی ــــ ان کا نام علیؑ تھا ــــ وہ ابوطالب کے بیٹے تھے اور ابوطالب ــــ عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ مزید یہ کہ علیؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن عبدالعزیٰ تھیں۔ وہ فاطمہ زہراؑ کے شوہر اور حسنؑ و حسینؑ کے والد تھے۔

بہت ہوا تو یہ جان لیا کہ علیؑ کس سال میں پیدا ہوئے ــــ کس سال میں شہید ہوئے اور انہوں نے کون کونسی جنگیں لڑی تھیں۔ یہ سب باتیں شناختی کارڈ کی سی پہچان میں آتی ہیں۔ یعنی اگر ہم علیؑ کے لیے ایک شناختی کارڈ جاری کرنا چاہیں تو اس کے لیے ان کے یہی کوائف معلوم کرنا ضروری ہوں گے۔ یعنی یہ علیؑ کی یعنی اسلام کے کامل انسان کی پہچان نہیں ہوگی۔ کیونکہ علیؑ کی پہچان کے معنی ان کے "شخص" کی پہچان نہیں بلکہ ان کی "شخصیت" کی پہچان ہے۔ گویا کہ ہمارے لیے علیؑ کی جامع شخصیت کا جس حد تک پہچاننا ممکن ہو اتنا ہی ہم نے اسلام کے ایک کامل انسان کو پہچانا ہے۔ پھر جہاں تک ہم اس کامل انسان کو اپنے لیے نمونہ قرار دیں اس کی راہ پر چلیں اور زبانی نہیں، عملی طور پر اسے اپنا امام اور پیشوا قرار دیں، خود اس کے تابع اور پیرو بنیں اور ہمیشہ کوشش کریں کہ اپنے آپ کو اس نمونے کی طرز پر ڈھالیں تو پھر ہم اس کامل انسان کے شیعہ کہلا سکتے ہیں۔ کیونکہ بقول شہید ثانیؒ:

"شیعہ وہ ہے جو امام علیؑ کی مشایعت کرے۔" (لمعہ ــــ کتاب الوقف)

کوئی انسان فقط زبانی تعریفیں کرنے اور تعلق جتانے سے شیعہ نہیں بن جاتا بلکہ شیعہ تو امام علیؑ کی مشایعت سے بنتا ہے۔ مشایعت کے معنی ہمراہ ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ کوئی کہیں جانے لگتا ہے تو آپ اس کی مشایعت کرتے ہیں۔ اس کے ہمراہ ہوتے اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ کسی کے ہمراہ ہو کر اس طرح چلنے کو

مشایعت کہتے ہیں۔ شیعہ علیؑ کے معنی بھی علیؑ کی عملی طور پر مشایعت کرنے والے کے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ کامل انسان کو پہچاننے کے دو طریقے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس پہچان کے مفاد کا بھی علم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ فقط ایک فلسفیانہ اور علمی بحث نہیں ہے کہ اس کا ماحصل محض ایک علمی نکتہ ہو۔ بلکہ اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور اگر ہم اسلام کے کامل انسان کو قرآن کے بیان سے یا قرآن کی پروردہ شخصیتوں کی شناخت کے ذریعے سے نہ پہچانیں تو ہم اسلام کے معین کردہ راستے پر نہیں چل سکتے، حقیقی اور سچے مسلمان نہیں بن سکتے اور ہمارا معاشرہ ــــ ایک اسلامی معاشرہ نہیں بن سکتا۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے کامل اور بلند مرتبہ انسان کو پہچانیں۔

"کامل" سے کیا مراد ہے؟

یہاں ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ درحقیقت "کامل" کے معنی کیا ہیں؟ بعض چیزیں بہت واضح ہوتی ہیں۔ لیکن جب انسان غور کرتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ دراصل ویسا نہیں ہے اور اس "واضح چیز" کے لیے بہت سی مشکل اور غیر واضح چیزوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے۔

عربی زبان میں "کمال" اور "تمام" ــــ دو الگ الگ الفاظ ہیں جو اپنے مفہوم میں ایک دوسرے کے نزدیک تو ہیں لیکن بعینہٖ ایک جیسے نہیں ہیں۔ البتہ ان دونوں الفاظ کی ضد میں ایک ہی لفظ آتا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں ان کی ضد کے مفہوم میں ایک سے زیادہ لفظ موجود نہیں اور وہی لفظ کبھی ان

میں سے ایک کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس میں خود یہ دو الفاظ بھی نہیں ہیں۔ اس لیے فارسی میں بھی یہی عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ عربی کے ان دو الفاظ میں سے "کمال" اور دوسرا "تمام" ہے۔ پھر عربی میں بھی ان دو الفاظ کی بجائے بعض اوقات "کامل" کہا جاتا ہے اور بعض اوقات "تام" کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں اور ان کے برعکس جو لفظ بولا جاتا ہے وہ ہے "ناقص"۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ کامل ہے اور وہ ناقص ہے یا کہا جاتا ہے کہ یہ چیز تام (تمام) ہے اور وہ ناقص ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا
اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔" (سورۃ مائدہ آیت ۳)

قرآن مجید نے یہ نہیں فرمایا کہ "اَتْمَمْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" کیونکہ اگر "اَتْمَمْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" فرماتا تو یہ عربی قواعد کی رو سے درست نہ ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں فرمایا کہ "اَكْمَلْتُ لَكُمْ نِعْمَتِيْ" بلکہ فرمایا ہے کہ "اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ"۔

اَكْمَلْتُ اور اَتْمَمْتُ میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق کیا ہے؟ اگر ہم ان دونوں کا باہمی فرق بیان نہ کریں تو اپنی بحث شروع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہماری بحث کی ابتدا ان دو لفظوں کے معانی سمجھنے ہی سے ہوتی ہے۔

تمام

"تمام" — اس موقع پر کہا جاتا ہے جب ایک چیز میں وہ سب کچھ وجود میں آ چکا ہو جو بنیادی طور پر اس کے لیے لازم ہو۔ یعنی اگر اس میں بعض چیزیں وجود میں نہ آئی ہوں تو بنیادی طور پر یہ چیز اپنی ماہیت میں ناقص ہے۔ کیونکہ اس کا تمام (پورا جسم) وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کا کچھ حصہ وجود میں آیا ہے اور اس میں کچھ کسر باقی ہے یعنی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نصف وجود ہے، اس کا تہائی حصہ موجود ہے یا اس کا دو تہائی حصہ موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً اگر ایک بلڈنگ یا مسجد ایک نقشے کے مطابق تعمیر کی جانی ہو اور اگر مسجد بنائی جائے تو اسکے لیے ایک ہال کی ضرورت ہوگی۔ پھر اس ہال کو دیواروں، دروازوں، چھت اور بہت سی چیزوں درکار ہوں گی۔ اسی طرح جب تک ایک بلڈنگ کو وہ تمام چیزیں میسر نہ ہو جائیں جن کی اسے حاجت ہے، اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن چیزوں کے نہ ہونے سے وہ بلڈنگ مکمل نہیں ہوتی جب وہ مہیا ہو جائیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ بلڈنگ تام یا تمام ہے اور تمام کے بالمقابل صورت کو ناقص کہتے ہیں۔

کمال

"کمال" — اس موقع پر کہا جاتا ہے جب ایک چیز "تمام" ہو جانے کے بعد ایک درجہ بلند تر جا سکتی ہو اور پھر اس بلند تر درجے سے بھی ایک درجہ بلند تر جا سکتی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس میں یہ کمال نہ بھی ہو تو بھی "تمام" اپنی جگہ پر

موجود رہتا ہے اور اگر کمال ہو تو وہ چیز ایک درجہ بلند تر ہو جاتی ہے۔

"کمال" کو عمودی سمت میں اور "تمام" کو افقی سمت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یعنی جب کوئی چیز افقی سمت میں اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ تمام ہو گئی اور اگر عمودی سمت میں حرکت کرے اور آخر تک پہنچے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کمال کو پہنچ گئی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کی عقل کامل ہو گئی ہے یعنی وہ پہلے بھی عقل رکھتا تھا لیکن اب اس کی عقل ایک درجہ بلند تر ہو گئی ہے یا کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا علم کامل ہو گیا ہے، یعنی وہ پہلے بھی علم رکھتا تھا اور اس سے استفادہ کرتا تھا لیکن اب اس کا علم ایک درجہ بلند تر اور کامل ہو گیا ہے اور اس نے کمال کا ایک مرحلہ طے کر لیا ہے۔

پس ہمارے معاشرے میں کوئی تو "تمام" انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک انسان وہ ہوتا ہے جو افقی نقطہ نگاہ سے ناتمام ہے۔ یعنی اس میں کسر ہے اور در حقیقت وہ نیم انسان ہے، تہائی انسان ہے، چوتھائی انسان ہے۔ یعنی وہ ایک "تمام" انسان نہیں ہے۔ لیکن ایک "تمام" انسان اس آخری حد تک کامل اور کامل تر ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا۔ اسے ہم "انتہائی کامل انسان" کہتے ہیں جو انسانیت کی بلندی کی آخری حد ہے۔

"کامل انسان" کی اصطلاح اسلامی ادبیات میں ساتویں صدی ہجری سے استعمال ہونے لگی ہے۔ اس سے پہلے اسکا کوئی وجود نہ تھا۔ اگرچہ موجودہ دور میں یہ اصطلاح یورپ میں بھی عام ہو گئی ہے۔ تاہم یہ سب سے پہلے دنیائے اسلام میں ہی ظاہر ہوئی تھی۔ وہ پہلا شخص کہ جس نے کامل انسان کو مسئلہ

اٹھایا اور اسے کامل انسان کی اصطلاح سے تعبیر کیا ـــــ وہ مشہور عارف محی الدین عربی اندلسی طائی ہے۔

محی الدین عربی اسلامی عرفان کا باوا آدم ہے یعنی اسلامی دنیا کے تمام عرفاء کہ جنہیں آپ جانتے ہیں وہ سب کے سب محی الدین ہی کے مکتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایرانی اور فارسی بولنے والے عرفاء بھی شامل ہیں جو ساتویں صدی کے شروع میں اور کچھ ساتویں صدی کے بعد بھی ہوئے ہیں۔ مولوی معنوی کو ہی لیجیے ـــــ وہ اپنی تمام عظمت کے باوجود عرفان کے معاملے میں محی الدین عربی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

محی الدین ـــــ عربی نژاد اور حاتم طائی کی اولاد میں سے تھے اور اندلس (موجودہ اسپین) کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے تمام اسلامی ممالک کے سفر کیے اور آخر شام میں فوت ہو گئے، جہاں ان کی قبر اس وقت بھی موجود ہے۔

صدر الدین قونوی ـــــ محی الدین عربی کے ایک شاگرد تھے، جن کا شمار محی الدین کے بعد بڑے بڑے عارفوں میں ہوتا ہے۔

اسلامی عرفان کو بڑی دقیق علمی صورت میں پیش کرنے کا کام محی الدین نے کیا اور صدر الدین قونوی نے اس کی تشریح اور توضیح کرنے کا فرض انجام دیا۔

مولوی معنوی ـــــ صدر الدین قونوی کے ہم عصر تھے۔ صدر الدین قونیہ کی ایک مسجد میں امام جماعت تھے اور مولوی معنوی وہاں جا کر ان کی اقتدا میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔

محی الدین عربی کے نظریات و تصورات انہی صدر الدین قونوی کے وسیلے سے مولوی معنوی کو منتقل ہوئے۔ یہ انوکھی اور نرالی باتیں جو آپ اس بارے میں سنتے

کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اگر ایک انسان ... ہو، معذور ہو، بدشکل ہو یا پست قد ہو تو آپ اس چیز کو اس کے لیے خامی یا نقص نہیں سمجھتے ہاں، ان خامیوں کو آپ اس کی شخصیت اور انسان کے لحاظ سے نقص شمار نہیں کرتے۔ مثلاً سقراط ہی کو لیجیے ـــــ یونان کا معروف فلسفی جسے پیغمبروں کے مرتبے والا سمجھا جاتا ہے، وہ اپنے زمانے کے انتہائی بدصورت افراد میں سے تھا۔ لیکن کوئی بھی اس کی بدصورتی کو انسان کی حیثیت سے سقراط کے لیے عیب نہیں سمجھتا یا عیب کہ ابو العلا معری نابینا تھا اور خود بھی کہتے رہتے تھے ... طہ حسین بھی نابینا تھے۔ کیا یہ اندھا پن ان کے جسم اور شخص (وجود) کا عیب ہے یا اس کی شخصیت کا عیب و نقص بھی شمار ہوتا ہے؟ نہیں ... نہیں ہے ... یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ انسان دو چیزیں رکھتا ہے ... شخص اور دوسری شخصیت، وہ ایک تن رکھتا ہے اور ایک روح ـــــ ایک جسم رکھتا ہے اور ایک روح۔ روح کا نظام جسم سے الگ ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی روح اس کے جسم کی تابع ہے، انہیں اصولی طور پر سو فیصد دھوکا ہوا ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ جب انسان کا جسم سالم ہو تو کیا اس کی روح بیمار ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ـــــ یہ چیز بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ جو لوگ روح اور اس کی حقیقت کے منکر ہیں وہ انسان کے تمام روحانی خواص کو اس کے مخصوص اعصاب کا براہِ راست اور بلاواسطہ نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق ہر چیز جسم کے تابع ہے اور روح کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ روح بیمار ہو تو لازمی طور پر جسم بیمار ہوگا کیونکہ روح کی بیماری جسم ہی کی بیماری ہے۔

خوش قسمتی سے موجودہ زمانے میں یہ بات بڑی حد تک ثابت ہو گئی ہے۔

ہیں اس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے کیونکہ اسلامی عرفان کے اصول کچھ اور ہیں اور ان ڈھکوسلوں سے بالکل الگ ہیں جن کا تعلق لوگ گھڑ گھڑ کر کتابوں اور رسالوں میں چھپواتے ہیں۔

محی الدین عربی نے جو مسائل پیش کیے ہیں ان میں سے ایک "کامل انسان" کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس نے یہ مسئلہ عرفان کے نقطۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ اگر ... ہوا اور اس بارے میں بحث کرنا ضروری ہوا تو میں اس موضوع پر قدرے زیادہ مفصل گفتگو کروں گا۔

اگرچہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے نقطۂ نظر سے کامل انسان کے بارے میں گفتگو کی ہے بلکہ محی الدین عربی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے انسان کامل کی اصطلاح کو استعمال کیا اور اسے خاص عرفانی نقطۂ نگاہ کے ساتھ بیان کیا۔

اب جبکہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کامل انسان قرآن کے نقطۂ نگاہ کے مطابق کیسا ہوتا ہے؟ لہٰذا مجبوراً اپنی بحث "سالم انسان" اور "ناقص انسان" سے شروع کرتے ہیں کیونکہ جب تک ہم پہلے مرحلے کو طے نہ کریں اُس مرحلے تک نہیں پہنچ سکتے۔

کیا ہمارے معاشرے میں سالم انسان اور معیوب انسان موجود ہیں؟ ان میں سے ایک پورا اور ایک ادھورا ہے۔ اس کا تعلق انسان کے تن اور بدن سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض انسان جسم کے لحاظ سے سالم ہیں اور بعض دوسرے معیوب یا مریض ہیں یا ان کے کسی عضو میں کوئی نقص ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص اندھا وغیرہ ہو لیکن ان چیزوں کا تعلق انسان کے تن سے ہے۔

یعنی ذہن سے ... انسان ... جسم ... کے معدے اور سرخ خلیوں
تعداد ... اعصاب بدن کی ... اور ... MATABOLISM
کے لحاظ سے ... یہاں تک کہ ... نفسیات کی رو سے
کے مطابق ... طبی اور نفسی لحاظ سے بھی ... بیماری ... ہو ... بس
... نفسیاتی نقطہ نگاہ سے بیمار ہو ... [illegible] ... سے
عقدۂ روحانی ... گرہ COMPLEX کا مریض ... ہو جو ...
روحانی رکھتا ہو ... آجکل کا علم بتاتا ہے کہ وہ ...
... یعنی ... کوئی اصل واقع ہو اس کے
نفسیاتی نظام میں ... ہو سکتا ہے ... نفسیاتی ... کا
علاج مادی دواؤں سے ... ایسے شخص کو لیجیے جو
"تکبر" ... رکھتا ہے ... ثابت ہو چکا ہے ...
ایک بیماری ہے ___ ... روح ... کا خلل ... کیا اس کے
... سے ... حاصل ہو سکتی ہے کہ ... سب سے
کھائے ... کا ... میں بدل جائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ایک
نفسی ... انسان ... ایک ... لگا ... گولیاں کھا کر ایک ...
... انسان میں تبدیل کر دیں؟ ... علاج تو ہو سکتا ہے ... کے
علاج کا طریقہ مختلف ہے۔ جیسا کہ بعض اوقات جسمانی بیماری کا علاج نفسیاتی طریقے
سے اور نفسیاتی بیماری کا علاج جسم کے ذریعے سے ہوتا ہے یہ بھی ایک عجیب
مسئلہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیماری تو جسمانی ہوتی ہے لیکن کچھ ذہنی
تحریکوں اور روحانی تعویذوں کے ذریعے سے انسان دوبارہ تندرست ہو جاتا ہے۔

... بات پر ... کہ ... ایک ... موجود ہے جو جسم ...
... ہے لیکن ... ہے اور ... تعلق نہیں ہے دیکھا
... کے مطابق یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔
روح ___ جسم پر اثر کرتی ہے ___ اور جسم ذہن پر اثر ڈالتا ہے۔
... دلیل ہے کہ انسان کا نفسیاتی نظام ... خود ایک مستقل
حیثیت رکھتا ہے۔

ہم کامل انسان کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ... تحقیق مفصل
بحث کرنے سے پہلے ہم نے سالم انسان اور معیوب انسان ... رہے ہیں۔
اس بحث کی تمہید کے طور پر ہے ... [illegible]
ہیں۔ ... عیب اور سلامتی کا روح ... [illegible]
... نہیں ... یہاں جسمی اعتبار سے بحث کریں ... [illegible]
کہ کونسا انسان سالم ہے اور ... اس کے بدن ... [illegible]
کیونکہ اس بات کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ... [illegible]
گفتگو بدن سے متعلق نہیں ہے۔ ... ممکن ہے کہ انسان نفسیاتی
نقطہ نگاہ سے مریض و معیوب ہو ... یہ بھی ممکن ہے کہ ... قرآن نے
بھی اس اصول کو بیان ... ہے ... ایک ...

"ان کے دلوں میں مرض ... اللہ نے ان کے
مرض کو اور بڑھا دیا ہے" (سورۂ بقرہ ...)

یعنی ان کے دل ... مرض ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ان کی
... میں ... [illegible] ... مرض نہیں ...

ذکر علم طب میں ہے بلکہ اس مقام پر انسان کے قلب سے مراد اس کی روح اور نفس ہے۔

نیز خدا قرآن کے بارے میں فرماتا ہے:

"اور ہم تو قرآن میں وہی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ مگر وہ ظالموں کیلئے تو گھاٹے کے سوا کچھ بڑھاتا ہی نہیں۔" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۲)

یعنی ہم نے قرآن مومنین کے لئے شفا اور رحمت کے طور پر بھیجا ہے۔

امیر المومنین فرماتے ہیں:

"تقویٰ تمہارے دلوں کے مرض کی دوا ہے۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۱۹۶)

نیز فرماتے ہیں:

"بلاؤں اور مصیبتوں میں سے ایک فقر ہے ... اور فقر سے بدتر بدن کی بیماری ہے ... اور بدن کی بیماری سے شدید تر انسان کے قلب کی بیماری ہے۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ حکمت ۳۸۸)

قرآن مجید کا ایک مقصد انسان کو سالم انسان بنانا ہے لیکن اس سے بہتر کہ ہم اپنے متعلق کامل انسان ہونے کی توقع رکھیں، جب کامل انسان کے نزدیک ہو رہے ہیں — ہمیں اپنا محاسبہ کرنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم بنیادی طور پر سالم انسان ہیں یا معیوب انسان ہیں۔

آفاتِ روح

جو چیزیں انسان کی روح پر آفت لاتی ہیں ہم یہاں ان کے متعلق مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں:

علم نفسیات کی رو سے انسان کی محرومیاں اس کی بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں یعنی اپنی محرومیوں کا احساس انسان کی بہت سی نفسیاتی گرہوں اور نفسیاتی بیماریوں کا ماخذ ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں فرائیڈ نے بالخصوص جنسی امور میں زیادہ تر جنسی محرومیت کے نظریہ پر انحصار کیا ہے۔ بہرحال یہ چیز بجائے خود ایک مسلمہ ہے کہ انسان کی محرومیاں اس کے اندر بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ بعض وقت انسان اپنے دل میں کسی شخص کے بارے میں کینے کا احساس کرتا ہے اس سے انتقام لینا چاہتا ہے اور جب تک اسے ملیامیٹ نہ کرلے آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ انسان کے اندر کینہ اور انتقام جوئی کی حس کیا چیز ہے؟ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔

ایک حاسد انسان جو دوسروں کے پاس کوئی نعمت دیکھتا ہے تو وہ اپنے لیے فکر نہیں کرتا اس کی تمام تر آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں سے وہ نعمت چھن جائے۔ سالم انسان حسد نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ کیونکر آگے بڑھے۔ اگر ایک انسان ہمیشہ اس فکر میں ہو کہ خود آگے بڑھے تو یہ اس کا عیب نہیں وہ سالم ہے لیکن اگر کسی شخص کو ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہے کہ دوسرا اس سے پیچھے رہ جائے تو وہ نفسیاتی بیمار اور مریض ہے۔ حسد کی ... آپ دیکھیں گے کہ حاسد لوگ بعض اوقات اس مرحلے پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ

سو دوسرے نقصان سے بچنے کے لیے پہلا نقصان برداشت کر لینا ہی بہتر سمجھے۔

ایک مشہور تاریخی داستان سے ہوتا ہے جو کتابوں میں درج کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی خلیفہ کے زمانے میں ایک دولتمند شخص نے ایک غلام خریدا۔ اس نے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ ایک غلام کے بجائے ایک آقا جیسا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ یعنی وہ اس غلام کو بہترین خوراک اور بہترین پوشاک دیتا اور آرام کی تمام سہولتیں مہیا کرتا تھا وہ اس کے ساتھ اپنے بیٹے —— بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت سے پیش آتا تھا اور اسے وافر مقدار میں روپیہ پیسہ دیتا تھا۔

وہ غلام حیران تھا کہ اس کا آقا ایسا سلوک کیوں کرتا ہے اور پریشان رہتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے اپنے غلام کو بہت سی رقم دے کر آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تب ایک رات اس دولتمند شخص نے اپنے غلام سے اپنے دکھ کا بیان کیا اور کہا:

"اے غلام! میں چاہتا ہوں کہ تمہیں آزاد کر دوں اور اتنی ساری دولت بھی تمہیں دے دوں۔ لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارا اس قدر خیال کیوں رکھتا ہوں؟"

غلام نے پوچھا: "کس لیے؟"

دولتمند شخص نے جواب دیا: "فقط ایک خواہش کی خاطر۔ اگر تم وہ ایک خواہش پوری کر دو تو جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے وہ تمہارے لیے حلال ہوگا۔ لیکن اگر تم میری وہ خواہش پوری نہ کرو گے تو میں تم سے راضی نہیں ہوں گا۔ اگر تم میری خواہش پوری کر دو تو میں تمہیں کچھ اور مال بھی دوں گا۔"

غلام نے کہا: "آپ بہت بڑی نعمت ہیں۔ آپ نے مجھے دوستوں جیسی زندگی دی ہے۔ آپ جو کچھ بھی کہیں گے میں وہ ضرور کروں گا۔"

اس نے کہا: "نہیں۔ تم مجھ سے پختہ وعدہ کرو۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے سامنے اپنی تجویز پیش کروں اور تم انکار کر دو۔"

غلام نے کہا: "آپ کی جو بھی تجویز ہے وہ بتائیے۔"

جب آقا نے اس سے پختہ قول لیا تو کہا: "میری تجویز یہ ہے کہ ایک خاص مقام اور وقت پر جس کے بارے میں میں تمہیں خبر دوں، تم میرا سر تن سے الگ کر دو اور ......"

غلام نے کہا: "کیا مطلب؟"

آقا نے کہا: "میں یہی چاہتا ہوں۔"

غلام نے کہا: "یہ تو ناممکن ہے۔"

آقا نے کہا: "بہرحال میں نے تم سے قول لے لیا ہے اور بات صرف اتنی سی ہے اور ......"

چنانچہ اس نے غلام کو آدھی رات کے وقت جگایا۔ ایک تیز چھری اس کے ہاتھ میں دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہمسائے کے گھر کے پچھواڑے لے گیا۔ پھر وہ وہاں لیٹ گیا اور نقدی کی ایک تھیلی غلام کو دی اور کہا: "تم یہاں میرا سر کاٹ دو اور جہاں بھی جانا چاہو چلے جاؤ۔"

غلام نے پوچھا: "آخر کیوں؟"

اس نے جواب دیا: "میں چاہتا ہوں کہ سب سمجھیں کہ میرے ہمسائے نے

دیکھ سکتا۔ چونکہ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے آگے نکل گیا ہے۔ بس اب میرے لیے زندہ رہنے کی بجائے مر جانا ہی بہتر ہے۔ میں اس کا رقیب تھا اور وہ میرا رقیب تھا۔ لیکن اس نے مجھ پر سبقت حاصل کر لی ہے اور میں آگ میں جل رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے سے یہ قتل اس کے ذمے لگ جائے اور اس کے نتیجے میں وہ پھانسی پا جائے تو مجھے سکون کا چین مل جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا رقیب وہی ہے۔ اگر میں یہاں مارا جاؤں گا تو پوچھا جائے گا کہ اسے قتل کس نے کیا ہے۔ تب کہا جائے گا لازماً اس کے رقیب نے ہی قتل کیا ہے۔ کیونکہ اس کی لاش بھی اسی کے پچھواڑے سے ملی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پکڑا جائے گا اور بالآخر اسے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ تب یہ صورت بن جائے گی اور میرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔"

غلام نے سوچا: "یہ تو احمق آدمی ہے تو میں یہ کام کیوں نہ کروں؟

— ہاں تم تو قتل کیے جانے کے قابل ہو" حاضرین کی ہنسی۔ یہ کہہ کر غلام نے اس احمق حاسد کا کام اور [illegible] کی تعمیل کر کے چلتا بنا۔

صبح ہوتے ہی قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس دولتمند آدمی کے رقیب کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اگر یہ قاتل ہوتا تو اپنے گھر کے پچھواڑے میں قتل نہ کرتا۔ اس طرح قتل کا معاملہ ایک معمّہ بن کر رہ گیا۔ دوسری طرف اس غلام کے ضمیر نے اسے چین نہ لینے دیا۔ وہ غلام وقت کے دربار میں حاضر ہو کر حقیقت حال کہنے پر مجبور ہو گیا

"وہ شخص ایسا ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے اور خود اس کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ وہ حسد کی آگ میں اس طرح جل رہا تھا کہ موت کو زندگی

پر ترجیح دیتا تھا۔"

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اصل ماجرا کیا ہے تو غلام کو بھی چھوڑ دیا گیا اور اس بے قصور قیدی کو بھی آزاد کر دیا گیا۔

ہاں، یہ ایک حقیقت ہے کہ حسد قلبی ایک بیماری ہے اور انسان حسد کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

قرآن فرماتا ہے:

"جس نے اپنے نفس کو پاک صاف رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گندہ کر دیا وہ بدبخت اور نامراد رہا۔" [illegible]

پس قرآن مجید کا پہلا مقصد تزکیۂ نفس ہے یعنی قرآن مجید نفس کو بیماریوں، گندگیوں، تاریکیوں، پریشانیوں اور کثافتوں سے پاک رکھنا بلکہ مسخ ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔

نفس کے مسخ ہونے کا مسئلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ [illegible] مسخ ہونے سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے اور آیات سے بھی [illegible] گزشتہ قوموں میں کچھ ایسے لوگ ہوتے تھے جنھوں نے بہت گناہ کیے۔ اس وقت کے پیغمبروں نے ان پر لعنت کی اور اس کے نتیجے میں وہ مسخ ہو گئے یعنی وہ انسان کی صورت سے تبدیل ہو گئے [illegible] بندر بن گئے یا [illegible] دوسرے حیوانوں کی صورت میں بدل گئے اور اسے کہتے ہیں "مسخ ہونا"۔ اب سوال یہ ہے [illegible] انسان [illegible] ممکن ہے [illegible] انسان [illegible] مسخ ہو [illegible] شکل میں تبدیل [illegible] اس کا روحانی اور معنوی [illegible]

ہو جانا ممکن ہے یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ روحانی طور پر ایک حیوان میں تبدیل
ہو جائے بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تبدیل ہو جانے کے اعتبار سے بڑا اور مکروہ حیوان
[illegible] ہو۔

چنانچہ قرآن مجید بھی ان لوگوں کی بات کرتا ہے۔ جو چوپایوں سے
بھی گئے ہیں۔ (سورہ اعراف آیت ۱۷۹)

کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی ہی میں انسان واقعی ایک حیوان میں تبدیل
ہو جائے؟ جی ہاں ___ انسان کی شخصیت اس کی اخلاقی اور روحانی
خصوصیات سے بنتی ہے۔ اگر انسان میں روحانی خصوصیتیں [illegible]
مثلاً اس میں ایک درندے اور ایک چوپائے کی صفات [illegible] اور
خصوصیتیں ہوں تو وہ واقعی مسخ شدہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی روح واقعی مسخ ہو جاتی ہے
اور وہ ایک حیوان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

حیوانوں میں سے سؤر ہی کو لیجیے ___ اس کا جسم اس کی روح سے
مناسبت رکھتا ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ایک انسان کی تمام خصوصیتیں سؤر
کی سی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو وہ انسانیت کے رتبے سے گر جاتا ہے۔ یعنی
اپنے باطن میں ___ حقیقت کی نگاہ میں [illegible] وہ سؤر ہے
اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

بس ایک معیوب انسان بعض اوقات مسخ شدہ انسان کے مرحلے پر
پہنچ جاتا ہے۔ ہم [illegible] دونوں سے متعلق کر سکتے ہیں۔ تاہم بعض اہل
[illegible] اس کے لیے یقین آنے کا

___ لیکن یہ حقیقت ہے۔

ایک شخص کا بیان ہے:

[illegible] امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ حج کر رہا تھا۔ جب [illegible]
[illegible] وہاں زیادہ سے زیادہ [illegible] چاہیں۔ [illegible]
[illegible] اس سے [illegible] حاجیوں کا سمندر [illegible]
[illegible] امام علیہ السلام سے [illegible]
کتنے زیادہ حاجی ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا "[illegible]"
کہتے کہ [illegible]

وہ شخص مزید کہتا ہے:

مجھے [illegible] امام نے [illegible] دی [illegible]
[illegible] کر دی۔ پھر اچانک آپ نے مجھ سے فرمایا [illegible]
دیکھو [illegible] سے [illegible] اور [illegible]
[illegible] ایک جیسے گھر [illegible] ___ [illegible]
کے درمیان چل پھر رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا "اب تم نے دیکھ لیا؟ یہ ہے اس معاملے کا باطن
[illegible] باطن کی نظر میں [illegible]
[illegible] اب اگر [illegible] خود [illegible] کا [illegible]
تو وہ [illegible] غلطی پر ہے۔

خود [illegible] رہتے ہیں [illegible] اور [illegible] انسانوں کی حقیقت

کا ادراک کر سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں جو انسان کم تر پستی کی طرف جا کر سونے اور جنسی عمل کے علاوہ کچھ نہ جانتا ہو اس کی روح حیوانی طور پر ایک چوپائے کی طرح ہے اور اس کا باطن واقعی مسخ ہو چکا ہے۔ یعنی انسانی خصوصیتیں اور انسانیت اس سے مکمل طور پر چھین گئی ہے اور اس نے خود اپنے لیے حیوانی خصلتیں اختیار کر لی ہیں۔

جیساکہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

﴿ جس دن صور پھونکا جائے گا اور تم لوگ گروہ در گروہ حاضر ہو گے۔ آسمان کھول دیے جائیں گے تو ان میں دروازے بن جائیں گے۔ پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔ (سورہ نبا۔ آیت ۱۸ تا ۲۰)

قیامت کے دن لوگ گروہ در گروہ محشور ہوں گے پیغمبر اکرمؐ نے بارہا کہا ہے کہ لوگوں کا فقط ایک گروہ انسان کی شکل میں محشور ہوگا اور دوسرے گروہ حیوانات کی شکل میں محشور ہوں گے۔ چنانچہ کچھ گروہ چیونٹیوں کی شکل میں کچھ گروہ سانپوں کی شکل میں کچھ گروہ بچھوؤں کی شکل میں کچھ گروہ بندروں کی شکل میں اور کچھ گروہ [illegible] کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ کیوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ بلا وجہ ایک انسان کو حیوان کی شکل میں تبدیل کرے؟ نہیں ـــــ بلکہ جو شخص دنیا میں بچھو بن کر رہا، سوائے ڈنک مارنے کے اس نے کوئی کام نہ کیا اور دوسروں کو ایذا پہنچانے میں ہی لذت محسوس کرتا رہا تو وہ اپنی حقیقی شکل یعنی بچھو کی شکل میں محشور ہوگا جو شخص اپنی خصلت میں بندر ہو اور جس نے دنیا میں بندروں جیسی حرکتوں کے علاوہ کچھ

نہ کیا ـــــ وہ قیامت کے دن یقیناً ایک بندر کی شکل میں محشور ہوگا نیز جو شخص اپنے طور طریقے میں ایک کتا ہے وہ ایک کتے ہی کی شکل میں محشور ہوگا۔ قیامت کے دن لوگ اپنی نیتوں، مقصدوں، خواہشوں، خصلتوں اور اپنی مستقل عادتوں کے ساتھ محشور ہوں گے۔ آپ اس دنیا میں کیا ہیں؟ دیکھنا چاہیے آپ دل میں کس چیز کی محبت رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی خواہشات ایک انسان کی خواہشات ہیں یا ایک درندے یا ایک پرندے کی ہیں؟ آپ کی خواہشات جس جانور کی سی ہیں آپ وہی ہیں اور جیسے کچھ ہیں آپ ویسے ہی محشور ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خدا کی پرستش کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ہم جس چیز کی پرستش کرتے ہیں ـــــ وہی بن جاتے ہیں۔ اگر ہم زر پرست بن جائیں تو روپیہ پیسہ ہماری ذات اور ہمارے وجود کا جزو بن جاتا ہے۔ یہی روپیہ پیسہ قیامت کے دن کی وہ شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ دھات دنیا میں جن لوگوں کا جزو بن گئی اور اس دھات کی ملکیت اور اس کی پرستش کے علاوہ ان کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ وہ آخرت میں بھی اس دھات کی شکل میں ہوں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسولؐ) ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ مال جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا "یہ ہے جسے تم نے اپنے

لیے جمع کر رکھا تھا۔" (سورۂ توبہ، آیت ۳۴-۳۵)

آپ دیکھیے کہ اب دعوت نے کتنی وضاحت کے ساتھ [illegible] کرنسی نوٹوں نے سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے کیونکہ دوسری دنیا میں [illegible] اور وہاں کے نوٹ بھی اسی آگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو سونے اور [illegible] سفید دھاتوں سے زیادہ جلاتی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو مسخ کر دیتی ہیں۔ یہیں پتا چلتا ہے کہ [illegible] معیوب انسان اور سالم انسان کے [illegible] کی جانب [illegible] کرتے ہوئے [illegible] معیوب انسان ہے۔ وہ ایک بیمار انسان ہے جو کسی مادی چیز کی پرستش کرتا ہے یعنی وہ اسے اپنے استعمال میں نہیں لاتا بلکہ اس مادی چیز کی [illegible] کرنے میں مصروف ہے۔ وہ ایک معیوب اور مسخ شدہ انسان ہے۔

ماہ رمضان کی [illegible] دعا اور [illegible] کی راتیں [illegible] عبادت کی [illegible] ہیں۔ کیونکہ اس مہینے کا اصل مقصد انسان سازی ہے یعنی اس مہینے کا مقصد یہ ہے کہ [illegible] معیوب انسان بنے آپ کو سالم انسانوں میں اور سالم انسانوں کو کامل انسانوں میں تبدیل کریں۔

ماہ رمضان کا مقصد تزکیۂ نفس کے ذریعے سے افراد انسانی کے عیوب و رذائل دور کرنے کے علاوہ معاشرتی خرابیوں کی اصلاح بھی ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں شعلۂ ایمان اور [illegible] نفسانی خواہشات پر قابو پاتے ہیں۔ یہ خدا کی پرستش کرتے، دعائیں مانگتے، خدا کی جانب پرواز اور یاد خدا

روح کی خشکی اور [illegible] کا مہینہ ہے۔ اگر قبول کر لیا جائے کہ ایک انسان ماہ رمضان کے مہینے میں بھوک پیاس برداشت کرے اور ایک [illegible] کی مجلس میں شریک ہو جہاں [illegible] تو [illegible] پہلے سے بھی بدتر ہو گیا ہے تو ایسے روزے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ روزہ فقط پیٹ تک محدود رہے بلکہ روزے کا مقصد یہ ہے کہ [illegible] انسان [illegible] کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہماری روایات میں ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے سوائے بھوک کے کچھ نہیں ملتا۔ انسان [illegible] ہے کہ وہ [illegible] ترک غذا کی مشق کرے تاکہ پھر وہ حرام بات کہنے سے اپنی زبان کو بند کرے یعنی وہ غیبت [illegible] تہمت [illegible] حلال [illegible] استعمال کرے۔

کیا آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا کہ ایک عورت رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئی [illegible] روزے سے تھی۔ رسول اکرمؐ نے [illegible] اور فرمایا: اس کو پی لو!

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں روزے سے ہوں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں ــــ تم روزے سے نہیں ہو۔ یہ پکڑو اور پی جاؤ۔

اس نے دوبارہ کہا: یا رسول اللہؐ! میرا روزہ ہے۔

آنحضرتؐ نے اصرار کیا اور فرمایا: لو پی لو!

اس عورت نے پھر یہی کہا کہ میرا روزہ ہے۔ کیونکہ اپنے تئیں کے مطابق وہ

واقعی روزے سے تھی۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: تم روزے سے کیسے ہو سکتی ہو جب کہ ایک ساعت پہلے تم نے اپنے [illegible] مومن بہن کا گوشت کھایا ہے۔ کیونکہ تم نے اس کی غیبت کی ہے ـــــ کیا تم جانتی ہو کہ ابھی تمہیں دکھاؤں کہ تم نے اس کا گوشت کھایا ہے؟ تم یہاں ابھی قے کرو!

جب اس عورت نے قے کی تو واقعی گوشت کا ایک لوتھڑا اس کے منہ سے گرا۔ اگر ایک آدمی روزہ بھی رکھے اور غیبت بھی کرے تو ایسی وہ ہے جس کا منہ تو حلال غذا سے بند کر لے اور اپنی روح کا منہ حرام کے لیے کھول دے۔

جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب کوئی انسان کسی کا جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے بدبو بلند ہوتی ہے جو ساتوں آسمانوں تک جاتی ہے اور اس سے فرشتوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ یہ بات [illegible] آسمان [illegible] بلکہ وہ سب کے سب [illegible]۔ جیسی [illegible] جہنم میں بدبوئیں ہیں [illegible] جہنم میں بدبو وہی ہے جو ہم اسی دنیا میں پیدا کرتے ہیں۔ وہ وہی جھوٹ ہیں جو ہم بولتے ہیں۔ یہی غیبت کا [illegible] ہے۔ جو تہمت لگاتا وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ تہمت لگانے میں جھوٹ کی برائی کے ساتھ غیبت کی برائی بھی شامل ہے۔ جو آدمی غیبت کرتا ہے وہ دوسروں کی جو برائیاں ان میں موجود ہوتی ہیں بیان کرتا ہے۔ جس آدمی کا سچ [illegible] ہو وہ [illegible] برائی نہیں کرتا اور جو آدمی جھوٹ بولتا ہے وہ [illegible] برائی بیان کرتا لیکن جو آدمی تہمت لگاتا ہے وہ [illegible] میں جھوٹ بھی بولتا ہے اور غیبت بھی کرتا ہے یعنی وہ بیک وقت دو کبیرہ گناہ کرتا ہے۔

والے ہیں اس دن پر کہ ایک ماہ رمضان گزر جائے اور اس میں ہم نے ایک دوسرے پر کئی ایک تہمتیں لگائی ہوں۔

ماہِ رمضان اس لیے آتا ہے کہ اس مدت میں زیادہ سے زیادہ مسلمان [illegible] ہوں اور اجتماعی عبادات [illegible] ماہ رمضان [illegible] کا باعث ہو۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

وَصَلَّى اللهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

دوسری نشست

مختلف موجودات کا کمال

جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے ___ خدا نے فرمایا کہ ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔

(سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۴)

ہر موجود کا کمال دوسرے موجود کے کمال سے مختلف ہے مثلاً کامل انسان کا کمال فرشتہ کے کمال سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر ایک فرشتہ اپنے درجے میں کمال کی ممکن اعلیٰ اور آخری حد تک پہنچ جائے تو وہ اس سے مختلف ہے کہ ایک انسان اپنے انسان ہونے میں کمال کی آخری حد تک پہنچ جائے۔ کیونکہ خود ہی پیغمبراں جنہوں نے ہمیں فرشتوں کے وجود سے آگاہ کیا ہے انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ

فرشتے وہ موجودات ہیں جو عقل محض، اندیشہ محض اور فکر محض سے پیدا کیے گئے ہیں یعنی ان میں خاکی، مادی، شہوانی، غضبی وغیرہ کیفیات وجود نہیں رکھتیں۔ یہ ہی موجودات ہیں کہ وہ محض عاقل ہیں اور جس چیز کو قرآن تعبیر نفس کی کہہ کر متعارف کراتا ہے وہ اس سے بے بہرہ ہیں۔

اس نشان ہی ایک ایسا موجود ہے جو ان اوصاف سے ملک سے مطلق جو حیوانات اور حیوانیوں میں وجود رکھتے ہیں۔ انسان ایک ایسا موجود ہے جو ملکوتی بھی ہے اور ملکی بھی۔ ملکوتی بھی ہے اور عقلی بھی۔ یہ تعبیر ایک حدیث کے متن سے ماخوذ ہے جو اصول کافی میں ہے

> بے شک خدا نے فرشتوں کو عقل دی اور شہوت نہیں دی اور حیوانوں کو شہوت دی اور عقل نہیں دی اور انسانوں کو عقل اور شہوت دونوں دی ہیں ___ پس جس انسان کی عقل اس کی شہوت پر غالب ہو ___ وہ فرشتے سے بہتر ہے اور جس انسان کی شہوت اس کی عقل پر غالب ہو وہ حیوان سے بدتر ہے۔
>
> (علل الشرائع باب ۶ صفحہ ۴ - الوسائل جلد ۱۱ صفحہ ۱۶۴)

یہ روایت اہل سنت کے ہاں بھی اس سے ملتی جلتی عبارت کے ساتھ موجود ہے اور مولوی معنوی نے بھی مثنوی میں اس حدیث کو نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(۱) حدیث میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کی مخلوق پیدا کی ہے۔

(۲) ایک گروہ کو پوری عقل، علم اور جود کا علم عطا کیا وہ فرشتہ ہے جو رکوع و سجود کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔

(۳) فرشتے کے منہ میں حرص و ہوا نہیں ہے وہ وہ نورِ مطلق ہے جو خدا کے عشق سے زندہ ہے۔

(۴) ایک دوسرا گروہ ہے جو دانش سے خالی ہے اور وہ حیوان ہے جو گھاس کھا کر موٹا ہوتا ہے۔

(۵) وہ اصطبل اور گھاس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا وہ شقاوت اور شرافت سے بے خبر ہے۔

(۶) تیسرا گروہ آدم زاد اور بشر ہے، جس میں آدھے اوصاف فرشتے کے اور آدھے گدھے کے ہیں۔

(۷) آدھے سے آدھے اوصاف سے وہ پستی کی جانب مائل ہوتا ہے اور فرشتے کے آدھے اوصاف سے بلندی کی جانب مائل ہوتا ہے۔

(۸) دیکھیے اس بلندی و پستی کی جنگ میں کون غالب آتا ہے اور ان دونوں میں سے کون بازی لے جاتا ہے۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۳۱۶)

وہ کہتے ہیں کہ ایک گروہ نورِ مطلق سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک گروہ غضب اور شہوت سے کہ جس سے مراد حیوانات ہیں، لیکن انسان کو دونوں سے مرکب پیدا کیا ہے۔ کامل انسان اور کامل حیوان میں فرق ہے۔ ایک اعلیٰ نسل کا اور کمال کی حد تک پہنچا ہوا گھوڑا ایک کامل انسان سے مختلف ہے۔ ایک کامل انسان اور ایک کامل فرشتہ بھی باہم مختلف ہیں۔ ان دونوں جنسوں سے کامل انسان کا فرق اس کی ذاتی ترکیب کی بنا پر ہے۔

جیساکہ قرآن مجید میں آیا ہے:

"ہم نے انسان کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے جس میں (امشاج کی اصطلاح کے مطابق) بہت سے اجزاء ملے ہوئے ہیں۔"

اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں اور وہ اس درجے میں پہنچ چکا ہے کہ ہم اسے آزما کر دیکھیں، یعنی وہ مرکب نطفہ انسان کی شکل میں کمال کی اس حد پر پہنچ گیا ہے کہ ہونے سے آزاد، مختار اور ذمہ داری اٹھانے کے لائق قرار دیا ہے۔ پھر اس کی اسی صلاحیت کی بدولت اسے امتحان و آزمائش میں ڈالا اور سزا و جزا کے قابل ٹھہرایا ___ لیکن دوسری مخلوقات میں یہ لیاقت نہیں ہے۔

"پس ہم نے اسے سننے دیکھنے والا بنایا، ہم نے اس کو راستہ بھی دکھا دیا۔ اب وہ خواہ شکرگزار ہو خواہ ناشکرا ہو"

(سورۂ دہر آیت ۲-۳)

انسان کی آزادی و اختیار اور اس آزادی و اختیار کی ضرورت کو اس سے بہتر اور زیادہ خوبصورت طریقے سے بیان کرنا ممکن نہیں کہ "ہم نے اسے آزمائش کے قابل بنایا ___ ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا اور جاننے والا قرار دیا ___ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا اور ... پس یہ خود انسان ہی ہے جسے اپنے راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔

لہٰذا کامل انسان وہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ ہم نے اس کو ایک نطفے سے پیدا کیا ہے جس میں بہت سے اجزا ملے ہوئے ہیں یعنی اس کے کامل ہونے کی وجہ اس کا مخلوط نطفے سے پیدا ہونا ہی ہے۔

کامل انسان اور فرشتے میں فرق ہے۔ کامل انسان کا کمال اس کے تعادل اور توازن میں ہے یعنی ان مختلف استعدادوں میں تعادل اور توازن جو اس میں موجود ہیں۔ ایک انسان اس وقت کامل انسان بنتا ہے جب اس کا جھکاؤ فقط ایک استعداد کی جانب نہ ہو اور دوسری استعدادوں کی طرف سے غفلت نہ کرے۔ بلکہ اس کے اندر جتنی صلاحیتیں اور استعدادیں ہوں وہ ان سب کو ترقی دے یعنی ان میں تعادل اور توازن قائم رکھے علماء کا کہنا ہے کہ حقیقی عدل ——— توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی تمام استعدادوں کے ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ترقی ہم آہنگ ہو۔

اس نکتے کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہم ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں مثلاً جب ایک لڑکا بڑھتا ہے تو اس کے ہاتھ ہوتے ہیں پاؤں ہوتے ہیں۔ سر ہوتا ہے، آنکھیں ہوتی ہیں، ناک ہوتی ہے، منہ ہوتا ہے، دانت ہوتے ہیں اور اس کے اندرونی اعضاء اور ذہنیت ہوتی ہیں۔

پس ایک سالم لڑکا وہ ہے جس کے تمام عضو بڑھیں اور ان کے بڑھنے میں ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہو۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک انسان ایسے بڑھتا ہے جیسے مضحکہ خیز کارٹون CARICATURE یعنی ایسا ہو کہ اس کے بدن کے باقی حصے تو نہ بڑھیں اور فقط اس کی ناک اتنی بڑھے کہ اس کے باقی بدن کے برابر ہو جائے یا اس کی آنکھیں یا سر بڑھے یا اس کے ہاتھ بڑھیں لیکن پاؤں نہ بڑھیں یا پاؤں بڑھیں مگر ہاتھ نہ بڑھیں تو ایسا شخص ترقی تو کر رہا ہے لیکن اس کے بڑھنے میں ہم آہنگی نہیں ——— اس لیے وہ

سالم انسان نہیں ہوتا

کامل انسان وہ ہے جس کی تمام انسانی قدریں [illegible] بڑھیں اور ان میں سے کوئی بھی نہ ہو جو بڑھنے سے رہ جائے یعنی وہ سب ایک دوسری کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بڑھیں اور بڑھ کر اعلیٰ درجے تک پہنچ جائیں۔ جب ایسا ہو جائے تو وہ انسان کامل ہو جاتا ہے اور یہ وہی شخص ہے جسے قرآن مجید امام سے تعبیر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

> جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی میری اولاد سے ———
> خدا نے فرمایا کہ ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام خدائے تعالیٰ کی جانب سے آنے والی بڑی بڑی آزمائشوں سے سرخرو نکلے، ان کاموں کو پورا کر دکھایا اور ان تمام امتحانوں میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ وہ کوئی ایک دو یا تین یا چار باتیں نہیں بلکہ وہ ایسے بڑے بڑے امتحان تھے کہ جن میں سے ایک امتحان خدا کی راہ میں اپنے ہاتھوں اپنے فرزند کا سر کاٹنے پر آمادہ ہو جانا تھا۔

انہوں نے خدا کی مرضی کے آگے یہاں تک سر تسلیم خم کیا کہ جب وہ سمجھ گئے کہ خدا اس بارے میں حکم دے رہا ہے تو بے چون و چرا ذبح فرزند پر تیار ہو گئے۔ بالآخر عمل کا وقت آ گیا۔

ؔ پس دونوں نے تسلیم کر لیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے
کے بل لٹا دیا۔ (سورۂ صافات۔ آیت ۱۰۳)

ابراہیمؑ بیٹے کو ذبح کرنے اور اسماعیلؑ ذبح ہونے کے
لیے جب مکمل طور پر آمادہ ہو گئے تو

ؔ ہم نے آواز دی اے ابراہیمؑ۔ تم نے اپنے خواب کو سچ
کر دکھایا۔ (سورۂ صافات۔ آیت ۱۰۴۔۱۰۵)

یعنی اے ابراہیمؑ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ یہیں تک تھا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ سچ مچ تم اپنے بیٹے کا سر کاٹ دو۔ جو کچھ ہم تم سے چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ ہمارے حکم اور ہماری مرضی کے مقابل تمہاری اطاعت کس حد تک ظاہر ہوتی ہے۔ یوں ابراہیمؑ آگ میں ڈالے جانے سے لے کر بیٹے کو قربان کرنے کے لیے لے جانے تک تمام امتحانوں سے کامیاب گزر گئے ہیں۔

ؔ اس میں شک نہیں کہ ابراہیمؑ ایک امت، خدا کے
فرمانبردار، سب سے ہٹ کر باطل سے کترا کر چلنے والے تھے۔ وہ ہرگز
مشرکین میں سے نہ تھے۔ (سورہ نحل۔ آیت ۱۲۰)

انہوں نے یکہ و تنہا ایک قوم اور ایک ملت سے مقابلہ کیا تو اس وقت ان سے کہا جاتا ہے:

ؔ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔
(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

یعنی اے ابراہیمؑ! اب تم اس مقام پر پہنچے ہو کہ تمہیں دوسروں کیلئے

امام ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اب تم ایک کامل انسان بن گئے ہو اور دوسرے انسانوں کو چاہیے کہ وہ کامل ہونے کے لیے تمہاری پیروی کریں اور تمہارے ساتھ مطابقت پیدا کریں۔

امام علی علیہ السلام بھی ایک کامل انسان ہیں ——— وہ اس لیے کامل ہیں کہ ان کے اندر تمام انسانی قدریں پروان چڑھیں۔ ترقی کے اعلیٰ درجے تک پہنچیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پھلی پھولیں ہیں۔ اب اگر انسانی قدروں نے ان تین شرطوں کے ساتھ ان کی ذات میں اعلیٰ درجے تک اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی ہے۔ بہتر ہوگا ہم یہاں ہم آہنگی کے اس مسئلے کی کچھ اور وضاحت کر دیں۔

آپ نے سمندر کا مد و جزر دیکھا ہوگا یا کم از کم اس کے بارے میں سنا ہوگا۔ چنانچہ سمندر ہمیشہ مد و جزر کی حالت میں رہتا ہے۔ کبھی کسی طرف کھینچ جاتا ہے اور کبھی اس طرف کھینچ جاتا ہے۔ یہ بات ہمارے لیے ثابت ہو چکی ہے کہ چاند سمندروں کے مد و جزر میں بہت زیادہ تاثیر رکھتا ہے سمندر بہت اضطراب رہتا ہے۔ کیونکہ وہ عموماً مد و جزر کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی وہ کبھی ادھر کو کھینچ جاتا ہے اور کبھی ادھر کو کھینچ جاتا ہے۔ قدرتی طور پر انسان کی روح اور انسانی معاشرہ بھی سمندر کی طرح ہمیشہ مد و جزر کی حالت میں ہوتا ہے۔ انسان کی روح ہمیشہ مد و جزر کی حالت میں ہوتی ہے اور اس طرف سے اس طرف کو کھینچ جاتی ہے۔ معاشروں کا بھی یہی عالم ہے اور وہ بھی کبھی ادھر اور کبھی ادھر کھینچے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ معاشروں کے کھینچے جانے کا سبب افراد یا دوسرے دقیقے ہوں لیکن صورت یہی ہے

اور بالفعل ممکن ان جوئی نشانیوں سے حتیٰ کہ انسانی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں
تو وہ انسان کی بھی یہی کیفیت ہے یعنی آپ ایسے افراد کو دیکھتے ہیں جن کا میلان
واقعی انسانی میلان ہوتا ہے لیکن بعض اوقات وہ انسانی خصلتوں میں سے
کسی ایک کی جانب ایسا ہی چڑھاؤ پیدا کر لیتے ہیں جیسے اُدھر کو کھینچے جا رہے
ہوں۔ پھر وہ یوں لڑھکتے چلے جاتے ہیں کہ باقی تمام دوسری قدریں بھول
جاتے ہیں۔ یہ ورم ایک ایسے آدمی کی مانند ہیں جس کا فقط کان یا ناک یا
ہاتھ بڑھتا جاتا ہے۔

معاشروں میں زیادہ تر انحراف ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔
تاہم اسلامی معاشرہ کسی وقت بھی اعتدال کی حالت گم ہونے کے سبب نہیں بڑھتا۔
بلکہ لوگ حق بات میں افراط کی وجہ سے بھی عدم توازن کا شکار ہو
جاتے ہیں اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی قدروں میں سے ایک
— عبادت ہے جس کی اسلام نے شدید تاکید کی ہے۔ تو عبادت سے اپنے
خاص معنوں میں عبادت کا ذکر مقصود ہے نہیں، اسلام میں ہر وہ کام عبادت ہے جو ایک
انسان خدا کی خاطر انجام دیتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کام کاج کرتا ہے اور اس
کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنا اور اپنے خاندان والوں کا پیٹ بھرے اور اپنے معاشرے
کی خدمت کرے تو وہ عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ لیکن عبادت اپنے خاص معنوں
یعنی خدا کے ساتھ خلوت کے معنوں میں نماز، دعا، مناجات اور تہجد وغیرہ
ہی ہے جو اسلام کے اجزاء ہیں اور اس میں سے حذف نہیں ہو سکتے۔ عبادت
بجائے خود ایک حقیقی قدر ہے ——— لیکن اگر اس میں حد سے زیادہ ترقی کی جائے
تو آپ دیکھیں گے کہ ایک معاشرہ فقط اسی قدر کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے یعنی

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ فقط عبادت کرنا، مسجد میں جانا، مستحب غسل کرنا، مستحب
نماز پڑھنا، دعا، کمیل، تعقیبات پڑھنا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنا ہی اسلام
بن جاتا ہے۔ یعنی وہ معاشرہ فقط انہی چیزوں کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ اور اگر وہ
اس راستے پر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو اس کی تمام دوسری قدریں مسخ ہو کر
رہ جاتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم تاریخ اسلام میں دیکھتے ہیں کہ اسلامی
معاشرے میں اس قسم کا رجحان پیدا ہو گیا تھا اور خاص طور سے ان اشخاص
کے جن پر کوئی تہمت نہیں لگائی جا سکتی ——— وہ اس راستے پر چل کر ایسے ہو گئے
کہ وہ اس میں توازن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک ایسا شخص بہت ہی ملکوتی ہو سکتا
ہے، کیونکہ اس نے صرف ایک ہی پہلو کی طرف توجہ دی تھی۔ حالانکہ اسلام
اپنے اندر مختلف خیالات کو ترقی دینا چاہتا ہے اور وہ ان سب کو یکساں ترقی دے
جس میں ہم آہنگی باقی رہے۔

رسول اکرمؐ کو اطلاع دی گئی کہ آپ کے کچھ اصحاب عبادت میں
محو ہو گئے ہیں۔ آنحضرتؐ اس کو سننے سے خفا ہوئے ——— مسجد میں تشریف
لائے اور با آواز بلند فرمایا:

"ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ میری
امت میں کچھ ایسے افراد پیدا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ میں خود جو
تمہارا پیغمبر ہوں ——— ایسا نہیں ہوں اور کبھی بھی رات سے
صبح تک عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ رات کے کچھ حصے میں آرام کرتا
ہوں، سوتا ہوں اور اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ اسی طرح
میں ہر روز نفلی روزہ بھی نہیں رکھتا، بلکہ کچھ دنوں کے روزے

رکھتا ہوں اور قیام دونوں میں غذا تناول کرتا ہوں۔

پس جن لوگوں نے عبادت میں غلو کرنے کا یہ راستہ اختیار کیا ہے وہ میری سنت سے دور ہیں۔۔۔!

ہاں تو جب پیغمبر اکرمؐ بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی قدروں میں سے ایک دوسری قدروں کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ جو ایک طرف ہو گیا ہے تو وہ اس کا سختی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

عمرو بن عاص کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ اور دوسرے کا نام محمد تھا۔ ان میں سے ایک (یعنی محمد) اپنے باپ کی مانند دنیادار، دنیا پرست اور حکومت کا خواہش مند تھا ـــــ اور اس کے تیسرے بیٹے کا نام نجیب تھا۔

عمرو بن عاص جب کبھی اپنے ان دو کردہ بیٹوں سے کوئی مشورہ طلب کرتا تو پہلا یعنی عبداللہ اسے امام علیؑ کی جانب دعوت دیتا اور کہتا کہ علیؑ کی حمایت کرو۔ جبکہ اس کا دوسرا بیٹا محمد کہتا تھا: نہیں ـــــ تمہیں علیؑ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا لہٰذا معاویہ کی طرف ہو جاؤ۔

عبداللہ کو عبادت سے لگاؤ تھا۔ ایک دن رسول اکرمؐ سے راستے میں ملے اور فرمایا: اے عبداللہ! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم راتوں کو صبح ہونے تک عبادت کرتے ہو اور دن میں روزہ رکھتے ہو۔

اس نے جواب دیا: یا رسول اللہؐ! ایسا ہی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: لیکن میں ایسا نہیں ہوں، میں اس چیز کو پسند بھی نہیں کرتا اور نہ یہ درست ہے۔

بعض اوقات کسی معاشرے کا جھکاؤ زہد کی جانب ہو جاتا ہے جو

یہ خود ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ زہد ایک ایسی قدر ہے جس کے پیچھے برکات اور فوائد ہوتے ہیں۔ اگر ایک معاشرہ خوشحالی کا منہ دیکھے یا کم از کم ہم اسے اسلامی معاشرہ کہہ سکیں تو یہ ناممکن ہے کہ اس میں یہ عنصر اور یہ قدر موجود نہ ہو۔ لیکن بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ یہی قدر سارے معاشرے کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور پھر ہر چیز زہد کی نذر ہو جاتی ہے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

ایک اور قدر خدمت خلق ہے جو انسان کی قطعی اور مسلم قدروں میں سے ہے ـــــ یہ ایک انسانی قدر ہے جس کی اسلام بھی تائید کرتا ہے اور یہ خلق خدا کا خدمت گزار ہونا ہے۔

اس بارے میں رسول اکرمؐ نے بڑی سفارش کی ہے اور قرآن مجید میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ آیا ہے۔ جیسا کہ اس نے باہم تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کے متعلق کہا ہے:

"نیکی یہی نہیں کہ تم نماز میں اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو خدا، قیامت، فرشتوں، خدا کی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے ـــــ وہ خدا کی محبت میں اپنا مال قرابتداروں، یتیموں، محتاجوں، پردیسیوں اور لونڈی و غلام کی گلو خلاصی میں صرف کرے۔"

(سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۷)

پھر اس آیت کے آخر میں اسی قدر یعنی خدمت خلق کا ذکر آتا ہے۔ یہ ایک ایسی قدر ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک زمانے میں

سعدی جیسا آدمی آتا ہے اور کہتا ہے:

؎ "عبادت بہ جز خدمت خلق نیست"

یعنی فقط یہی ایک قدر ہے اور بس۔ اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔ نہ ہم شیخ سعدی تک میں ایسے نہ تھے کہ خدمت کے علاوہ کوئی عبادت نہ کرتے ہوں۔ بلکہ یہاں انہوں نے شعر کی رو میں خدمت خلق کی اہمیت واضح کی ہے۔ اس کے برعکس بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عبادت کی قدر کی نفی کریں زہد کی قدر کی نفی کریں علم کی قدر کی نفی کریں اور جہاد کی قدر کی نفی کریں ـــــ غرضیکہ ان تمام عظیم قدروں کی یکلخت نفی کر دیں جو اسلام میں موجود ہیں اور یہ نعرہ لگائیں کہ انسانیت ـــــ یعنی خلق خدا کی خدمت ہی واحد انسانی قدر ہے۔

آجکل بالخصوص ہمارے کچھ روشن خیال حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک بہت ہی بلند منطق ان کے ہاتھ آ گئی ہے اور انہوں نے اسے انسانیت اور انسان دوستی کا نام دے رکھا ہے۔ انسان دوستی سے کیا مراد ہے؟ اس کے معنی خلق خدا کی خدمت کرنے کے ہیں۔ خلق خدا کی خدمت کرنا بڑی اچھی بات ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ خلق خدا میں کون کون شامل ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ہم نے خلق خدا کا پیٹ بھی بھر دیا اور اس کا بدن بھی ڈھانپ دیا۔ گویا یہ کام کر کے ہم نے بہت لوگوں کی خدمت کی ہے۔ اگر ہم خلق خدا کے لیے کسی بلند تر قدر کے قائل نہ ہوں اور تمام قدریں "خلق خدا کی خدمت" تک محدود ہوں تو نہ خود ہم میں اور نہ کسی دوسرے میں کوئی قدر موجود ہو گی۔ پھر

تمام خلق خدا "بھیڑوں کا ایک ریوڑ" یا "گھوڑوں کا ایک گلہ" بن جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے کچھ حیوانوں کا پیٹ بھر دیا اور انہیں ڈھانک دیا۔ اگرچہ یہ بھی ایک اچھا کام ہے۔ لیکن کیا انسان کا انتہائی مقام یہی ہے کہ ہم اس کا پیٹ بھر دیں اور وہ اپنی حیوانیت پر برقرار رہے؟ کیا میری خدمت کرنے کی آخری حد بھی یہی ہے کہ بکرے ہی جیسے حیوان کی خدمت کروں؟ کیا میرے جیسے دوسرے حیوانوں کی آخری حد یہ ہے کہ وہ کسی اپنے جیسے کی دستنہ میری خدمت کریں؟ نہیں ـــــ بلکہ خدمت یہ ہے کہ انسان کی خدمت ایک قدر تو ہے مگر اس انسان میں انسانیت کا ہونا شرط ہے۔ میں نے پیشتر عرض کیا ہے کہ بھیڑیں و لومڑیاں بھی انسان ہے اور چوہے بھی انسان ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ خلق خدا ہے کسی بھی ہو مسئلہ فقط خلق خدا کی خدمت کا ہے۔ تو پھر بھیڑیں و لومڑیاں اور چوہے بھی ایک خلق ہے ـــــ تب ان کے درمیان فرق کیوں کرتے ہیں؟ اگر سب خدمت خلق ہی کا ہے تو پھر ابوذر اور معاویہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا یہ مسائل ہی ہم میں ایک قسم کی دردسر نہیں ہے؟

اس کے علاوہ مثلاً آپ آزادی کی قدر کو لیجیے۔ آزادی عظیم ترین اور بلند ترین قدروں میں سے ہے جو انسان کی حیوانیت کی حد سے بلند تر ہیں۔ انسان کے لیے آزادی مادی قدروں سے بڑھ کر ایک قدر ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جن میں معمولی سی بھی انسانیت ہوتی ہے اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ چاہے بھوکے رہیں۔ ان کے تن پر کپڑا نہ ہو اور وہ بڑے مشکل حالات میں زندگی بسر کریں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ کسی دوسرے کے اسیر یا محکوم ہوں۔

بلکہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کتاب "..." میں ایک داستان نقل کی گئی ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب داستان ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ بو علی سینا کچھ مدت وزیر بھی رہا تھا، لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وزارت کے نتیجے میں اسے اپنا علمی کام چھوڑنا پڑا۔ بے شمار مصروفیتوں کے باوجود اگرچہ وہ اپنی زندگی اور رات دیر تک صرف کرتا تو اس نے جو کچھ بھی ... سے کہیں بڑھ کر کارنامے انجام دیتا، جیسا کہ ... جیسے ... محسوس کرتے ہیں کہ یہ عظمت وزارت کی اس وادی میں کھو گئی۔ ایک دن بو علی سینا بڑے ٹھاٹھ باٹھ اور وزارت عظمیٰ کے رعب داب کے ساتھ ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔ اتفاق سے وہ ایک ... کے پاس سے گزرا جہاں ایک خاکروب صفائی کر رہا تھا۔ وہ غیر معمولی خوش ... تھا اور اس کے ... اس نے خاکروب کی ... اور اسے پتہ چلا کہ وہ یہ شعر گنگنا رہا ہے:

گرامی داشتم اے نفس از آنت
کہ آسان بگذرد بر دل جہانت

وہ اپنے آپ سے خطاب کر کے کہہ رہا تھا کہ اے میرے نفس! میں تجھے اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ تیرا وقت اچھا کٹے۔

بو علی سینا کو یہ دیکھ کر ہنسی آگئی کہ یہ شخص سب سے کثیف کام انجام دے رہا ہے اور پھر اپنے نفس پر احسان دھر رہا ہے اور کہہ رہا ہے: ...
گرامی داشتم ای نفس از آنت   کہ آسان بگذرد بر دل جہانت

بو علی سینا نے اپنا گھوڑا ایک طرف کھڑا کیا، آگے آیا اور اسے آواز دے کر کہا: انصاف تو یہ ہے کہ تم نے اپنے نفس کو اتنا عزیز رکھا کہ اس سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔ جب خاکروب نے اس کا چہرہ بشرہ اور لباس ذرا دیکھا تو اس نے پہچان لیا کہ یہ وزیر اعظم بو علی ہے۔ تب اس نے کہا: میں نے یہ پیشہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ تمہاری طرح کسی دوسرے کا محکوم بن کر نہ رہوں۔ تم یہ جو مال و متاع اور شان و شوکت رکھتے ہو ... خاکروب کا کام کر کے آزاد رہنا اس سے بلکہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے ... یہ ہے کہ تم محکوم اور تابع ہو اور ......

کہتے ہیں کہ بو علی سینا ترس کے مارے ... اور کہا کہ اس منطق کا کوئی جواب نہیں ہے۔

یہ ... و تعریف ... حقیقت ہے ــــ ... ہے؟ اس ... منطق میں کوئی معنی نہیں رکھتی ... آدمی ... اور ... حکومت اور وزارت کو چھوڑ کر ... جائے اور یہ آزادی کی باتیں کرے۔ کیا آزادی کوئی ایسی چیز ہے جسے کھو دیا جا سکے؟ نہیں، لیکن انسان اعلیٰ ... کے لیے آزادی اتنی قیمت رکھتی ہے کہ وہ خاکروبی کو ... پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ آزادی واقعی ایک قدر ہے اور بہت بڑی قدر ہے۔ بعض اوقات انسان دیکھتا ہے کہ ... قدر بالکل بھلا دی گئی ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ انسان میں ... پھر جب ... تو وہ کہتا ہے کہ ... کے معنی "آزادی" کے ہیں۔ بشر کے معنی "آزادی" کے ہیں اور آزادی کے

علاوہ کوئی قدر وجود ہی نہیں رکھتی یہی وہ مقام ہے جہاں تمام قدریں اس ایک قدر میں گم ہو جاتی ہیں جس کا نام "آزادی" ہے۔

ایک اور قدر "محبت" ہے ایک قدر "حکمت" ہے اور "عرفان" وغیرہ بھی ہے۔

بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ "عشق" پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، حتیٰ کہ جو کچھ ہمارے عرفان و تصوف اور عرفانی غزلوں میں ہے وہ فقط ایک انسانی قدر "عشق" پر منحصر ہو کر رہ جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا— حسن ازل نے اپنا جلوہ دکھایا اور فرشتے نے اسے دیکھا مگر وہ جذبۂ عشق سے عاری تھا؛

فرشتہ عشق نداند کہ چیست قصہ مخوان
بخواہ جام و گلابی بہ خاک آدم ریز

فرشتہ نہیں جانتا کہ "عشق" کیا ہے؟ کیونکہ اس نے یہ قصہ نہیں
پڑھا۔ اس نے معرفت کا جام چڑھایا اور اس کی تلچھٹ
خاک آدم پر ڈال دی۔

پھر وہ دیگر تمام قدروں حتیٰ کہ عقل کی جانب بھی توجہ نہیں دیتے جو عرفاء کا میلان "عشق" کی جانب ہوتا ہے دراصل وہ عقل کے خلاف میلان رکھتے ہیں اور عقل کے ساتھ باقاعدہ جنگ کرتے ہیں۔

جیسا کہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

عارف از پرتو می راز نہانی دانست
گوہر ہر کس ازیں لعل توانی دانست

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر داند و بس
کہ نہ ہر کو ورقی خواند معانی دانست
ای کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی
ترسم این نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

ایک عارف شراب کی جگہ میں رہ حقیقت کو پا لیتا ہے، اس لیے تو بھی اس لعل کے ذریعے ہر انسان کی صلاحیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

مجموعۂ گل یعنی ذات جامع صفات (خدا) شناس کو سحر کا پرندہ ہی جانتا ہے کیونکہ ہر پڑھنے والا کتاب کے معنی سے واقف نہیں ہوتا۔

اے شخص کہ جو عقل کے ذریعے سے عشق کو سمجھنا چاہتا ہے مجھے ڈر ہے کہ تو اس نکتے کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکے گا۔

مجموعۂ گل سے مراد وہ ذات (یعنی خدا) ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ آخری شعر میں انہوں نے اہل معنا سے خطاب کیا ہے جس سے "اشارات" کے آخر میں عشق کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ پھر ان کے ہاں معنوی طور پر انسان اور انسانیت کو "عشق" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عقل جو محکوم اور پابند ہے اس لیے وہ کلی طور پر رد کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقت آتا ہے کہ دوسری طرف سے ایک اور قدر آگے لائی جاتی ہے۔ یعنی اس وقت انسانی قدر صرف "عقل" اور "فکر" ہی شمار کی جاتی ہے اور بس۔ وہ کہتے ہیں کہ جب عشق کے بارے میں یہ کیا عجیب سی باتیں ہیں۔ یہ سب محض وہم و خیال کی باتیں ہیں اور یہ لیلیٰ ہیں اور وہ لیلیٰ ہیں وغیرہ...

پھر جب حسن کے متعلق یہ باتیں اہل سبب کے سامنے آتی ہیں تو وہ کہتا ہے:

عشق کے بارے میں جو کہا جاتا ہے وہ نری خیال آفرینیاں ہیں۔ اس کی بجائے انسان کو "عقل کی سواری کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے" ان ساری باتوں کا کیا مطلب ہے؟ ہاں! ان سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف قدریں ہیں جو انسان میں موجود ہیں مثلاً "عقل"، "عشق"، "محبت"، "عدالت"، "خدمت"، "عبادت" اور "آزادی" — پھر ان قدروں کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کامل انسان کون ہے؟ کیا وہ جو عابد محض ہے؟ کیا وہ جو زاہد محض ہے؟ کیا وہ جو مجاہد محض ہے؟ کیا وہ جو محض آزادی کا خواہاں ہے؟ کیا وہ جو عاشق محض ہے؟ کیا وہ جو عاقل محض ہے؟ ... ان میں سے کون کامل انسان ہے؟

ہمیں یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی کامل انسان نہیں ہے۔ کامل انسان وہ ہے جس میں یہ تمام قدریں اعلیٰ درجے تک بڑھی ہوں اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی ہو۔ اس معیار کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام علی علیہ السلام ایسے ہی کامل انسان ہیں۔

آپ امام علیؑ کی خطبات کی کتاب "نہج البلاغہ" سے رجوع کریں جو سید رضی کا انتخاب اور امیر المومنین کے ارشادات کا ایک حصہ ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سید رضی چونکہ ایک ادیب تھے اس لیے انہوں نے نہج البلاغہ کے صرف ادبی پہلو سے بحث کی ہے اور امیر المومنینؑ کے کلام سے شاہکار ادبی جملوں کا انتخاب کیا ہے۔ آجکل نہج البلاغہ میں ۲۳۹ خطبے ہیں جب کہ مروج الذہب کے مؤلف مسعودی — جو سید رضی سے سو سال پہلے پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ اس وقت امام علیؑ

کے تقریباً ۴۸۰ خطبے لوگوں کے پاس موجود تھے۔

نہج البلاغہ کیسی کتاب ہے؟ اس میں آپ کو ہر قسم کا عنصر ملتا ہے۔ جب انسان نہج البلاغہ کا مطالعہ کرتا ہے تو ایک مقام پر خیال کرتا ہے کہ بوعلی سینا کچھ کہہ رہا ہے — دوسری جگہ وہ سمجھتا ہے کہ مولوی معنوی یعنی جلال الدین رومی گفتگو کر رہا ہے — پھر جب مطالعہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ پہنچتا ہے تو اسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود وہی کچھ کہہ رہا ہے جو آزادی کا متوالا ہو اور جسے آزادی کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوجھتا۔

اس کے بعد آدمی ایک اور جگہ نگاہ ڈالتا ہے تو احساس کرتا ہے کہ ایک عابد شب زندہ دار گفتگو کر رہا ہے یا کوئی حقیقی زندہ دل سب کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے اندر تمام انسانی قدریں رکھتے ہیں۔ در حقیقت وہ کلام اس کی روح کا آئینہ ہوتا ہے۔ پس نہج البلاغہ میں آپ دیکھیں کہ امام علی کتنے عظیم — اور ہم کتنے کوتاہ ہیں۔

تقریباً پچاس سال پہلے — جبکہ دینی اور مذہبی مسائل میں ہمارا معاشرہ فقط زہد اور عبادت کی قدروں کی جانب میلان رکھتا تھا۔ اس وقت آپ کہیں بھی جاتے تو دیکھتے تھے کہ ایک واعظ منبر پر بیٹھتا اور نہج البلاغہ میں سے پڑھ کر سناتا تھا۔ وہ کیا پڑھتا تھا؟ سنیے کہ جو خطبے بالعموم پڑھے جاتے تھے ان کی تعداد مجموعی طور پر دس سے بیس تک تھی۔ یہ نہج البلاغہ کے وہ خطبے تھے جن کا تعلق زہد اور موعظت سے تھا۔ مثلاً:

"لوگو! یہ دنیا گزرگاہ ہے اور آخرت جائے قرار
اس گزرگاہ سے اپنی منزل کے لیے توشہ اٹھا لو جس کے

سامنے تمہارا کوئی بھید چھپا نہیں رہ سکتا۔ اس کے سامنے اپنے پردے چاک نہ کرو۔ قبل اس کے کہ تمہارے جسم دنیا سے الگ کر دیے جائیں، اپنے دل اس سے ہٹا لو۔ اس دنیا میں تمہیں جانچا جا رہا ہے لیکن تمہیں پیدا تو ایک دوسری چیز کے لیے کیا گیا ہے۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۲۰۱)

ان ایام میں نہج البلاغہ کے باقی خطبے نہیں پڑھے جاتے تھے کیونکہ معاشرہ انہیں جذب اور قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاشرے نے کچھ دوسری قدروں کی جانب میلان پیدا کر لیا تھا۔ لہٰذا نہج البلاغہ کے انہیں حصوں کا پڑھنا معمول بن گیا تھا جو ان قدروں کے بارے میں تھے۔ اسی طرح سو سال گزرنے کو گئے لیکن اس طویل مدت میں شاید ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا تھا جو مالک اشتر کے نام امیر المومنین علیہ السلام کا فرمان پڑھتا کہ جو اجتماعی اور سیاسی احکام کا ایک خزانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ درحقیقت اس معاشرے کی روح ان چیزوں کی خواہش اور شوق نہیں رکھتی تھی۔

امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام نہج البلاغہ میں اس طرح ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"... میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کئی موقعوں پر فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اس قوم میں پاکیزگی نہیں آ سکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ عہد نامہ ۵۳ ... مالک اشتر)

پچاس سال میں تو اسلامی معاشرہ اس چیز کی روح اور اس بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا کہ وہ صحیح طور پر سمجھ سکے کہ امام علی علیہ السلام کہتے ہیں: رسول اکرم نے فرمایا کہ کوئی امت پاکیزگی و طہارت اور تقدس کے مقام تک نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس سے پہلے کہ وہ اس مرحلے پر پہنچ سکے تو جب ایک کمزور آدمی ایک طاقتور شخص کے بالمقابل کھڑا ہو جائے اور بغیر اس کے کہ اس کی زبان لکنت کرے ـــــ وہ اپنا حق اس سے طلب کرے۔

چنانچہ ۵۰ سال پہلے کا معاشرہ ان الفاظ کی قدر و قیمت نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس معاشرہ نے بے سوچے سمجھے قدروں ... میں سے صرف ایک یا دو قدروں کی جانب میلان کر لیا تھا لیکن جہاں تک امام علی علیہ السلام کے کلام کا تعلق ہے تو تمام انسانی قدریں علی کے قول، عمل اور شخصیت میں موجود ہیں۔

اگرچہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ قدریں زندہ ہو گئی ہیں لیکن یہاں میں اپنے معاشرے کی تعریف نہیں کرنا چاہتا۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ایسی قدریں پیدا ہو گئی ہیں، مگر مجھے ڈر ہے کہ یہ قدریں پھر کہیں یک طرفہ نہ ہو جائیں اور بعض دوسری قدروں کو مٹا دینے کا موجب نہ بن جائیں۔ نہیں ـــــ نہیں! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم پر لازم ہے کہ امام علی علیہ السلام کو اپنے لیے نمونہ اور اپنا امام سمجھیں، یعنی ایک کامل انسان کو ـــــ ایک متعادل انسان کو اور ایک ایسے انسان کو اپنے لیے نمونہ بنائیں جس میں تمام انسانی قدریں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ترقی کی

ہے یعنی ایک ایسے انسان کو اپنے لیے نمونۂ عمل اور اپنا امام و پیشوا جب بھی
کہ جب رات ہو جاتی ہے اور وہ خدا کے ساتھ راز و نیاز اور دعا و مناجات
کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے تو کوئی عارف اس کے رتبے کو نہیں پہنچتا۔ تب عبادت
کی وہ روح جو حق میں جذب ہونا، حق کی جانب کھنچا جانا اور حق کی جانب پرواز
کرنا ہے ـــــ وہ اس میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

آپ اکثر دیکھتے ہوں گے کہ جب کوئی انسان ایک کام میں سرگرم اور منہمک ہو مثلاً وہ لڑائی جھگڑے کی حالت میں ہو، اگر اس اثنا میں اسے ایک چوٹ آ لگے جو اس کے بدن یا بازو کا ایک حصہ کاٹ دے تو چونکہ وہ لڑائی میں اتنا سرگرم اور منہمک ہوتا ہے یعنی اس کی توجہ لڑائی پر اس طرح مرکوز ہوتی ہے کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے بازو کے گوشت کا ایک ٹکڑا الگ ہو گیا ہے۔ امام علیؑ بھی عبادت میں اس قدر سرگرم اور منہمک ہوتے تھے اور عشق الٰہی کا شعلہ ان کے وجود میں اس طرح بھڑک اٹھتا کہ یوں لگتا جیسے وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہوں نے خود اس گروہ کی اس طرح تعریف کی اور نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

> علم نے انہیں ایک دم حقیقت و بصیرت کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے۔ وہ یقین و اعتماد کی روح سے گھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا، ان کو اپنے لیے سہل و آسان سمجھ لیا ہے۔ جن چیزوں سے جاہل بھڑک اٹھتے ہیں ان سے جی لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ دنیا میں ایسے جسموں کے ساتھ رہتے ہیں کہ جن کی روحیں ملاء اعلیٰ

> سے وابستہ ہیں۔ (دیکھیے نہج البلاغہ، مفتی جعفر حسین، حکمت ۱۴۷)

امام علیؑ ایسے عابد ہیں کہ عین حالت نماز میں تیر ان کے بدن سے نکالا جاتا ہے لیکن وہ حق اور عبادت میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ انہیں ہوش ہی نہیں آتا اور احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ محراب عبادت میں اس قدر روتے اور پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ تو تھیں ان کی راتیں ـــــ لیکن جب دن نکلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص وہ آدمی نہیں جو رات کو محراب میں تھا۔ وہی علیؑ جب دن میں اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھتا تو ان کا چہرہ ہنستا مسکراتا اور بشاش ہوتا تھا ۔۔۔ ہمارے آجکل کے ان زاہدوں اور عابدوں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ جو لوگ جب زاہد اور عابد بن جاتے ہیں تو ان کی خاصیت یہ ہے کہ ان کی ناک بھوں چڑھ جائے اور ماتھے پر بل ڈالے رکھتے ہیں اور لوگوں پر دھونس بھی جماتے ہیں۔

امام علیؑ کے اصحاب کہتے ہیں:

آپ کے اوصاف میں سے ایک یہ تھا کہ آپ بہت بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ آپ اتنے خوش طبیعت حتیٰ کہ بذلہ گو تھے کہ جب عمرو بن عاص نے آپ کے خلاف پروپیگنڈا کرنا چاہا تو کہتا تھا کہ علیؑ خلافت کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ وہ خندہ رو ہیں۔ خلافت کے لیے ایک سخت آدمی چاہیے تاکہ لوگ اس سے ڈریں۔

اس کا ذکر نہج البلاغہ میں ہے۔ جسے امیرالمومنینؑ خود نقل کرتے ہیں:

۱۳ "نابغہ کے بیٹے، عمرو بن عاص، پر حیرت ہے کہ وہ میرے
بارے میں اہل شام سے کہتا پھرتا ہے کہ مجھ میں مزاح پایا
جاتا ہے اور میں تفریح میں پڑا رہتا ہوں۔ اس نے غلط
کہا اور کہہ کر گنہگار ہوا۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۸۲)

وہ لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔
حتیٰ کہ جب وہ ایک مجاہد اور ایک سپاہی کی شکل میں میدان جنگ میں دشمن
کا سامنا کرتے ہیں تو بھی ان کا چہرہ مسکراتا ہوا ہوتا ہے۔

جیسا کہ آپ کے بارے میں کہا گیا:

۱۴ "وہ علیؑ ہیں جو رات کو محراب عبادت میں بہت رونے
والے اور میدان جنگ میں بہت ہنسنے والے ہیں"

(الغدیر جلد ۲ صفحہ ۲۶)

یہ کیسی مخلوق ہیں؟ اصلاً یہ قرآنی انسان ہیں اور قرآن ایسے
ہی انسان چاہتا ہے:

۱۵ "اس میں شک نہیں کہ رات کا اٹھنا خوب نفس کشی
اور ٹھکانے سے ذکر کرنے کا وقت ہے .... دن
کے وقت تمہارے اور بھی بڑے بڑے کام ہیں"

(سورہ مزمل۔ آیت ۶-۷)

رات کو عبادت کے لیے اور دن کو چلنے پھرنے اور معاشرے میں عمل
سرگرم رہنے کے لیے رکھنے والا انسان معلوم ہوتا ہے کہ رات ایک اور شخصیت

کی ہے اور دن کسی اور شخصیت کا ہے۔

میں حافظ شیرازی کے یہ شعر آپ کو اس لیے سنا رہا ہوں کہ
حافظ ان لوگوں کا جزو بن گئے ہیں جو انہیں جوانوں کے انحراف اور گمراہی
کا وسیلہ قرار دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک عظیم شخصیت اور ایک مشتاق
سالک ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا کام شراب خوری اور عیاشی رہا ہے
تو جوان کہتے ہیں کہ چلو ہم بھی حافظ کی طرح ہو جاتے ہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے
کہ ہم ایسے نہیں ہیں کیونکہ حافظ کے تمام اشعار عارفانہ، پُرمعنی
اور پر مغز ہیں۔

درحقیقت حافظ شیرازی قرآن کے مفسر تھے اور انہوں نے اسی کی
تاریخ بیان کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے بلکہ ایک عالم شخص تھے۔ وہ
اپنی وفات کے دو سو سال بعد تک ان کا شمار علماء میں ہی ہوتا تھا۔ وہ کبھی
کبھی شعر بھی کہہ دیتے تھے، لیکن دو سو سال بعد ان کا علمی پہلو چھپ گیا اور وہ
ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ وہ ایک ایسے عالم تھے جو بنیادی
طور پر مفسر قرآن تھے اور اس کی تفسیر میں مشغول رہتے تھے اور زمخشری
کی کشاف کا درس دیتے تھے۔ وہ ایک عارف، مفسر اور عالم شخص تھے۔
تو درحقیقت اس دنیا کے بندے نہیں تھے اور ان کے اشعار بھی ایک مرموز
زبان میں ہیں۔ چونکہ وہ مفسر تھے اور قرآنی آیات کی پیچیدگیوں کو خوب
سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اس موضوع کو کہ "رات عبادت کا وقت
ہے اور دن حرکت اور کاروبار کا وقت ہے" حافظ شیرازی نے اسے اپنی
مرموز زبان میں یوں نظم کیا ہے:

روز در کسب هنر کوش که می خوردن روز
دل چون آئینہ در زنگ ظلام اندازد
آں زماں وقت می صبح فروغ است کہ شب
گرد خرگاہ افق پردہ شام اندازد

دن کو کارِ جہاں میں لگا رہ — کیونکہ دن میں شراب پینے سے دل پہ زنگ آجاتا ہے۔

صبح کی طرح چمکتی ہوئی شراب پینے کا وقت وہ ہے جب افق پر رات کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔

امام علی علیہ السلام ایسے ہی ہیں کہ ان کا ذکر وہ وحدت ہے جو بصفت اور یہ تعبیر جو ہم اس وقت بیان کر رہے ہیں یعنی "کامل انسان" بلکہ جامع الاضداد یعنی مختلف اوصاف میں کمال رکھنے والے انسان سے جیسے ہم تعبیر کرتے ہیں امام علی علیہ السلام ہزار سال سے پہلے اور آج تک اسی صفت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود سید رضی نہج البلاغہ کے مقدمے میں کہتے ہیں:

"میں جو بات ہمیشہ اپنے دوستوں کو بتاتا ہوں اور ان کو حیرت میں ڈالتا ہوں وہ یہی موضوع یعنی امام علی علیہ السلام کے کلام کے گوناگوں پہلو ہیں کہ انسان ان کے کلام کے جس حصے میں پہنچتا ہے دیکھتا ہے کہ وہ پہلی دنیا سے مختلف ایک اور دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ پھر وہ ایک اور مقام پر پہنچتا ہے اور دوبارہ دیکھتا ہے کہ یہ ایک اور ہی دنیا ہے۔ ایک وقت میں وہ عابدوں کی دنیا میں اور ایک وقت زاہدوں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت فلسفیوں کی دنیا میں اور ایک وقت عارفوں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں

سپہ سالاروں اور افسروں کی دنیا میں اور ایک وقت میں عادل حاکموں کی دنیا میں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں قاضیوں کی دنیا میں اور ایک وقت مفتیوں کی دنیا میں ہوتا ہے وعلیٰ ہذا ......

چنانچہ انسان دیکھتا ہے کہ علی تمام دنیاؤں کی سیر کرتے ہیں اور تمام دنیاؤں میں اس طرح موجود ہیں کہ بشریت کی دنیاؤں میں سے کسی دنیا سے غائب نہیں ہیں۔

صفی الدین حلی آٹھویں صدی ہجری میں کہتے ہیں:

جمعت فی صفاتک الاضداد
ولهذا عزت لک الانداد

آپ کی ذات میں مختلف متضاد صفات جمع ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے ... آپ کے ساتھ ہے۔

آپ حاکم ہیں، حلیم ہیں، شجاع ہیں، زاہد ہیں، سخی ہیں، فقیر بھی اور ......

وہ مزید کہتے ہیں:

آپ عالم بھی ہیں اور حلیم بھی ہیں۔ عام طور پر یہ دو چیزیں ایک دوسری سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ آپ انتہائی درجے کے حلیم، انتہائی درجے کے شجاع اور انتہائی درجے کے خونریز ہیں۔ جب خون بہانا ضروری ہو تو آپ اس خبیث خون کو بہاتے ہیں جو بہایا جانا چاہیے۔ آپ انتہائی درجے کے عابد ہیں۔ آپ فقیر ہیں اور آپ کو دینے والا کوئی نہیں بلکہ آپ خود عطا کرنے والے ہیں۔ آپ مال نہیں رکھتے اور جو کچھ آپ کے ہاتھ میں آتا ہے بخش دیتے ہیں کیونکہ:

قرار در کف آزادگان نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

جو لوگ حرص دنیا سے آزاد ہیں ان کے ہاتھ میں روپیہ نہیں ٹھہرتا۔ جیسے عاشق کے دل میں صبر اور چھلنی میں پانی نہیں ٹھہرتا۔

وہ اسی طرح آپ کی صفات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں:

حتی یحن الشیء من [illegible]
ویعب [illegible]

وہ کہتے ہیں کہ یہاں تک کہ آپ کا خدائی تخلیق اور تمام اک بے کر نہیں اس کی عافیت سے شرمسار ہے اور آپ کی نجابت وہ عجیب اور بڑا بھاری عالم ہے کہ جو اور دھاتیں اس کے سامنے پیش کر پانی ہو جاتی ہیں۔

پس آپ کیسے انسان ہیں؟ آپ کی اصلیت وہ قسم خلاف ہے؟ یہ گرفت یہ ثابت قدمی اور یہ قوت؟ تو پھر آپ کس طرح سے بشر ہیں؟

پس کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو تمام انسانی قدروں کا مالک ہو اور انسانیت کے تمام میدانوں میں گویا سبقت لے گیا ہو۔ اب ہم امام علیؑ جیسے کامل انسان سے کیا سبق سیکھیں؟ ہمیں ان سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ فقط ایک قدر کو لے کر دوسری قدروں کو نہ بھلا دیں۔ ہم تمام قدروں میں تو اونچے درجے پر نہیں جا سکتے، لیکن ہمیں چاہیے کہ جس حد تک ممکن ہو ایک دوسرے کے ساتھ تمام قدریں ہم آہنگ کریں۔ اگر ہم

کامل انسان نہیں ہیں تو کم از کم متعادل انسان تو ضرور بن جائیں۔ اس وقت ہوگا جب ہم تمام میدانوں میں ایک حقیقی مسلمان کی شکل میں داخل ہوں گے۔

پس یہ ہیں معنی کامل انسان کے اور یہ ہیں نمونے کامل انسان کے — اس بارے میں باقی باتیں میں انشاء اللہ آئندہ نشست میں کروں گا۔

○

رمضان کا مبارک مہینہ یعنی وہ آخری مہینہ جو امام علی علیہ السلام پر گزرا — وہ ایک مختلف رمضان تھا۔ اس رمضان میں امام علیؑ کے لیے ایک عجیب سرور تھا — لیکن آپ کے خاندان کے لیے وہ مہینہ (پہلے دن سے ہی) پریشانی اور اضطراب سے گزرا تھا۔ جو رمضان کے گزرے ہوئے تمام مہینوں کے مقابلے میں اس دوران امام علیؑ کی روش بڑی مختلف تھی۔ آپ توجہ فرمائیں کہ میں ایک مرتبہ قرآن کی ایک آیت میں سے ایک آپ کے سامنے عرض کرنے والا ہوں۔

۲۱ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا
وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لائے — چھوڑ دیے جائیں گے اور ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۲)

اس آیۂ شریفہ میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور فرمایا گیا ہے کہ کیا مسلمین یہ

خیال کرتے ہیں کہ ہمیں آزمائش میں نہیں ڈالیں گے؟ نہیں بلکہ ہم انہیں ضرور آزمائیں گے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ رسول اکرمؐ کے بعد اس امت کو بڑے سخت امتحان اور آزمائشیں پیش آئیں گی۔ تب میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! جو کچھ اس آیت میں بتایا ہے اس کا کیا مقصد ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: "یا علیؑ! میرے بعد میری امت امتحان اور آزمائش میں ڈالی جائے گی۔" (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، خطبہ ۱۵۴)

امام علیؑ مزید فرماتے ہیں:

میں نے رسول اکرمؐ سے پھر عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جو لوگ احد میں شہید ہوئے ان کی تعداد ستر تھی اور ان کے سردار حمزہ بن عبد المطلب تھے جو احد کے حامی سپہ سالار تھے۔ مجھے شہادت کا موقع نہ ملا اور میں اس فیض سے محروم رہ گیا۔ اس پر میں بہت مضطرب ہو کر سوچتا ہوں کہ میں یہ فیض کیوں حاصل نہ کر سکا اور یہ فیض مجھ سے کیوں دور ہو گیا؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: "ان مقامات پر شہادت نصیب نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں، آخر تمہیں راہ خدا میں شہادت کا شرف حاصل ہوگا۔"

جنگ احد میں امام علی علیہ السلام تقریباً ۲۵ سال کے جوان تھے۔ بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے نئے نئے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے اور ابھی امام حسنؑ کے سوا اور کوئی فرزند نہ تھا۔ شادی شدہ جوانوں کی خواہش یہ آرزو

ہوتی ہے کہ ان کی زندگی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی چلی جائے۔ لیکن ذرا آپ امام علی علیہ السلام کو تو دیکھیے کہ ان کی واحد اور بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہو جائیں!

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے علیؑ! تم بھی شہید ہو جاؤ گے۔

پھر سوال کیا: اے علیؑ! شہادت کے وقت تم کیسے صبر کرو گے؟

امام علیؑ نے عرض کیا: آپ یہ فرمائیں کہ کیسے صبر کروں گا بلکہ یہ دریافت کیجیے کہ کیسے شکر گزار ہوں گا؟ کیونکہ یہ صبر کا نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

چنانچہ اپنی زندگی کے اس آخری رمضان میں امام علیؑ پر ایک عجیب کیف و سرور طاری تھا، جبکہ آپ کے بچے بہت مضطرب و پریشان تھے۔ آپ کی شہادت کے بارے میں جو خبر رسول اکرمؐ نے دی تھی اور جو علامتیں نزد امام علی علیہ السلام کو معلوم تھیں، کبھی کبھی ان کا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ ان علامات کی موجودگی کے نتیجے میں آپ کے اہلبیتؑ اور قریبی اصحاب کے دلوں میں اضطراب اور بے قراری پیدا ہو گئی تھی کیونکہ آپ عجیب طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔

اور جب اپنی زندگی کے آخری رمضان میں ہر رات کہیں نہ کہیں مہمان ہوتے لیکن وہاں بہت ہی کم کھانا کھاتے تھے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر آپ کے بیٹوں بیٹیوں کا دل کڑھتا تھا اور ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی، کیونکہ وہ آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ وہ پوچھتے: آپ اتنا کم کھانا کیوں کھاتے ہیں؟

آپ فرماتے: میں چاہتا ہوں کہ اپنے خدا سے اس حالت میں ملاقات

کروں گا جو میرے پیٹ خالی ہو۔ وہ سمجھ جاتے تھے کہ ہمارے بابا امام علیؑ کو عنقریب ہی دنیا سے جانا ہے تو ہم کو کسی چیز کا انتظار ہے بعض اوقات آپ آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے۔

"میرے حبیب رسول کریمؐ نے جو خبر دی ہے وہ صحیح ہے انہوں نے جو پیش گوئی فرمائی وہ جھوٹ نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ وقت نزدیک ہے اور بہت ہی نزدیک ہے۔

میں پہلے ہی سے یہ عرض کرتا چلوں کہ امام علیؑ نے ماہ رمضان کے تیرھویں دن ایک ایسی بات کہی جس نے بہت زیادہ پریشانی پیدا کر دی ظاہر ہے وہ جمعہ کا دن تھا اور آپ خطبہ دے رہے تھے۔ تب آپ نے فرمایا:

میرے بیٹے حسینؑ! اس مہینے کے کتنے دن باقی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، سترہ دن۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں اب وہ وقت نزدیک آگیا ہے جبکہ یہ ڈاڑھی اس سر کے خون سے رنگین ہو جائے گی۔

پھر جب ماہ رمضان مبارک کی انیسویں تاریخ آئی تو امام علی علیہ السلام کے فرزند آپ کے پاس آئے اور رات کا کچھ حصہ آپ کی خدمت میں رہے پھر امام حسنؑ اپنے گھر چلے گئے۔ امام علیؑ کا ایک خاص حجرہ تھا جہاں آپ راتوں کو عبادت کیا کرتے اور سوتے نہیں تھے۔ جب اپنے کاموں یعنی زندگی اور معاشرے کے کاموں سے فارغ ہوتے تو اپنے اس حجرے میں جاکر خدائے تعالیٰ سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ابھی تک طلوع نہیں ہوئی تھی کہ امام حسنؑ اپنے والد گرامی کے پاس آئے اور سیدھے ان کے حجرے میں گئے۔ امیرالمومنین علیہ السلام اپنے ان فرزند کا خاص احترام کرتے تھے جو

بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اولاد تھے۔ اس طرح آپ حضرت زہراؑ اور رسول کریمؐ کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ پس آپ نے اپنے بیٹے حسنؑ سے فرمایا:

"اے پیارے بیٹے! مجھے پچھلی رات بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔ میں نے عالم خواب میں رسول اکرمؐ کو دیکھا تو عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں نے آپ کی اس امت کے ہاتھوں بہت صدمے اٹھائے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ان پر نفرین کرو! میں نے ان پر نفرین کی اور چاہا کہ خدا مجھے ان سے ملے اور ایک نالائق شخص کو ان پر مسلط کر دے۔ ہاں وہ تھی وہ بات بڑی عجیب ہے کہ لوگوں نے امام علی علیہ السلام سے موافقت نہ کی اور ان کے راستے پر چلنے پر آمادہ نہ ہوئے جو آپ لے، نہیں دکھایا۔ امام علیؑ کو دو گروہوں نے اول میں پہلے تو اصحاب عائشہ تھے جنہوں نے بیعت توڑ دی تھی۔ اس کے بعد معاویہ ابن ابی سفیان نے دھوکے سے کام لیا اور مختلف حربے معاویہ دیں کے تیر طرار آدمیوں میں سے تھا یعنی وہ اتنا چالاک تھا کہ یہ معلوم تھا کہ امام علیؑ کو کن باتوں سے دلی تکلیف پہنچتی ہے اور وہ وہی کام کرتا تھا۔ تیسرا اور آخری گروہ خوارج کا تھا۔ یعنی وہ خشک لوگ جو اپنے پکے عقیدے، ایمان اور خلوص سے امام علیؑ کو کافر گردانتے تھے! کیا آپ کو علم نہیں کہ وہ امام علیؑ کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسان امیرالمومنینؑ کے مصائب پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کیونکہ اتنے مصائب برداشت کرنے کی تو ایک پہاڑ میں بھی طاقت نہیں ہے! آپ بتائیں کہ امام علیؑ جیسا دوسرا کون ہے جیسا کہ حضرت علیؑ ـــــ رسول کریمؐ کو عالم رویا میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں

مجھے آپ کی امت نے کتنے صدمے پہنچائے ہیں، میں ان کے ساتھ کیا کروں؟

پھر آپ نے فرمایا: پیارے بیٹے! آپ کے نانا نے مجھے حکم دیا کہ اے علیؑ! ان مخالفوں پر نفرین کرو۔ ورنہ میں نے بھی عالم رؤیا میں ان پر نفرین کی، جو اس طرح تھی:

یعنی، خدا مجھے جلدی موت دے دے اور ان پر ایسا حاکم مسلط کرے جس کے یہ لائق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس جملے سے کسی پریشانی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔

جب آپ گھر سے باہر آتے ہیں اور بطخیں چلاتی ہیں تو آپ فرماتے ہیں:

۲۳؎ ہاں! اس وقت تو صرف پرندوں کی آواز ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ اسی جگہ انسانوں کے نوحہ و ماتم کی آواز سنائی دے گی۔

(کشف الغمہ صفحہ ۲۳۰ - منتہی الآمال صفحہ ۱۷۲)

امیرالمومنینؑ کے فرزندوں نے آپ کا راستہ روکا اور عرض کیا:

بابا جان! آج ہم آپ کو مسجد نہیں جانے دیں گے۔ لازم ہے کہ آپ کسی دوسرے کو اپنے نائب کے طور پر مسجد بھیج دیں۔

پہلے تو آپ نے فرمایا کہ میرے بھتیجے جعدہ بن ہبیرہ سے کہو کہ جا کر لوگوں کو نماز پڑھائے لیکن بعد میں آپ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور فرمایا: نہیں ۔۔۔ میں خود جا رہا ہوں۔

انہوں نے عرض کیا: آپ اجازت دیں کہ کوئی آپ کے ہمراہ جائے۔

آپ نے فرمایا: نہیں ۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ہمراہ جائے۔ وہ رات آپ کے لیے پسندیدہ رات تھی اور آپ کا یہ ارشاد آپ کے انجام کا نقیب ہے:

۲۴؎ میری مثال اس شخص جیسی ہے جو رات بھر پانی کی تلاش میں چلے اور صبح ہوتے ہی چشمے پر پہنچ جائے اور میں اس ڈھونڈنے والے کی مانند ہوں جو مقصد کو پا لے۔

(نہج البلاغہ فیض الاسلام وصیت ۲۳)

ضربت لگنے کے بعد جب آپ کو بستر پر لٹایا گیا تو یہ جملے ارشاد فرمائے:

"خدا کی قسم جب یہ ضرب میرے سر پر لگی تو میری مثال اس عاشق جیسی تھی جو اپنے معشوق تک پہنچ جاتا ہے۔"

نیز میری مثال اس شخص جیسی تھی جو اندھیری رات میں پانی کا چشمہ تلاش کرتا ہے تاکہ اپنا خیمہ اور ساز و سامان لے کر وہاں پہنچ جائے۔ پھر اگر اسے پانی کا چشمہ مل جائے تو وہ کتنا خوش ہوتا ہے۔ ہاں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس کے بارے میں حافظ نے کہا ہے:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
اندران ظلمت شب آب حیاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آن شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

کل رات وقت سحر مجھے غم دوراں سے نجات مل گئی۔ جب کہ رات کے اندھیرے میں مجھے آب حیات سے سیراب کر دیا گیا۔

وہ کیسی مبارک رات اور کیسی اچھی صبح تھی —— وہ تو
شبِ برات تھی کہ جس میں مجھے تازہ نصیب سے نوازا گیا۔

آپ نے فرمایا: میں تو جانتا ہوں خدا جانے کہ آپ کے دل میں کیا کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ آپ خود فرماتے ہیں: میں نے بہت کوشش کی کہ اس بات کا راز بیان کروں اور آپ نے اس کی بعض خصوصیات بیان کیں۔ تاہم آپ مکمل طور پر یہ جانتے تھے کہ مجھے ایک بہت بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔

نہج البلاغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"... میں نے اس معاملے کا راز جاننے کی بہت کوشش کی لیکن خدا نے نہ چاہا سوائے اس کے کہ اس کو پوشیدہ کر دے۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، خطبہ ۱۴۷)

گھر سے چل کر آپ مسجد میں آ پہنچے۔ صبح کی اذان آپ خود دیا کرتے تھے۔ اذان کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لیے آپ گلدستۂ اذان پر تشریف لے گئے اور "اللہ اکبر" کی آواز بلند کی۔ اذان دے کر طلوع ہونے والی اس صبح کو خدا حافظ کہا اور فرمایا: اے صبح! اے نورِ سحر! جب سے علیؑ نے اس دنیا میں آنکھ کھولی ہے کیا کوئی ایسا دن گزرا ہے کہ تو طلوع ہوئی ہو اور علیؑ سو رہا ہو؟ بس اے سپیدۂ صبح! آج کے بعد علیؑ کی آنکھ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔

جب آپ اذان کے چبوترے سے اترنے لگے تو فرمایا:

"... مومن و مجاہد کو راستہ دو۔"

وہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا
اس وقت اور لوگ بھی مساجد کی طرف آ رہے ہیں

(دیوان علی بن ابی طالب)

یہاں آپ اپنا ایک مجاہد و مومن کے طور پر تعارف کرا رہے ہیں۔ پریشانی اور اضطراب کا دور دورہ ہے... امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ اس اضطراب کے بعد نوحہ و ماتم ہوگا۔ آپ کے بعض گھر والے بیدار لیکن بے چین ہیں کہ خدایا اس رات ہمیں کیا حادثہ پیش آنے والا ہے؟ کیا ہمارے والد اس رات کسی حادثے سے دوچار ہوں گے؟ پھر اچانک ایک چیخ و پکار نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا —— انہوں نے ایک آواز سنی جو ہر جگہ گونج رہی تھی:

"قسم بخدا کہ ہدایت کے ستون گر گئے —— اور تقویٰ کے نشان مٹ گئے —— دینداری کی مضبوط رسی ٹوٹ گئی —— محمد مصطفیٰ ﷺ کے ابن عم شہید ہو گئے، وصی رسولؐ شہید ہو گئے —— علی مرتضیٰؑ شہید ہو گئے —— انہیں ایک بڑے شقی نے شہید کر دیا ——" (منتہی الآمال)

نہیں کوئی قوت مگر وہ کہ جو بڑی شان والے خدا سے ملتی ہے۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

وَصَلَّى اللهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّاهِرِيْنَ

تیسری نشست

انسان کی ماہیت

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ انہوں نے پوری کر دیں۔ تب خدا نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے ـــ خدا نے فرمایا ہاں مگر میرے اس عہدے پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔

(سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ـــ انسان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اس کے متعلق ایک دوسرے کے بالمقابل دو بنیادی نظریے ہیں جن میں سے ایک نظریہ خدا پرستوں اور دوسرا مادہ پرستوں کا ہے۔

خدا پرستوں کے نظریے کے مطابق انسان جسم اور روح سے مرکب ایک موجود ہے۔ انسان کی روح جاودانی ہے اور انسان کے مرنے سے فنا نہیں ہوتی۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں دین کی تعلیمات اور بالخصوص اسلامی نصوص اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔

مادہ پرستوں کے نظریے کے مطابق انسان اسی بدن ـــ اور اسی بدن کے مظاہر کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں اور مر جانے پر محض نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے بدن کی تحلیل کے معنی انسان کی شخصیت کا تحلیل ہو جانا ہے۔

باوجودیکہ انسان کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں یہ اختلاف موجود ہے لیکن ایک اور معاملے کے بارے میں جو اس مسئلے سے وابستہ ہے، اختلاف نظر نہیں ہے۔ وہ معاملہ یہ ہے کہ یک سلسلہ امور ایسے موجود ہیں جو مادیات کی جنس سے نہیں ہیں اور انہیں معنویات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن پر انسان کی شخصیت اور قدر و قیمت منحصر ہے اور انسان کا انسان ہونا انہی امور کی بدولت ہے۔ اگر انسان سے یہ خصوصیات لے لی جائیں تو انسان اور حیوانات میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ انسان کی انسانیت اس کی جسمانی ساخت کی بنا پر نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو شخص ایک سر دو کان رکھتا ہو، اس کے ناخن چپٹے اور قد سیدھا ہو تو وہ انسان ہے خواہ کوئی بھی ہو اور کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ وہی بات ہے جو سعدی نے ان الفاظ میں کہی ہے:

تن آدمی شریف است بجان آدمیت — نہ ہمیں لباس زیباست نشان آدمیت
اگر آدمی بچشم است و دہان و گوش و بینی — چہ میان نقش دیوار و میان آدمیت

انسان کا بدن اس کی روح کے باعث قابل قدر ہے، صرف یہ مناسب

انسان ہی آدمیت کی نشانی نہیں ہے۔ اگر یہی منہ، ناک، کان اور آنکھ ہی آدمی انسان ہے تو پھر دیوار پر کھنچی ہوئی آدمی کی تصویر اور خود اس آدمی میں کیا فرق رہے گا۔

یہ جو کہتے ہیں کہ آدمی بننا اور آدمی ہونا مشکل ہے اور ایک مثل ضرب المثل علموں کے ہاں مرتب ہوئی اور مشہور ہوگئی۔ ... یعنی "ملا شدن چہ آسان" "آدم شدن چہ مشکل" پس اگر اس بدن کے معنی ہی آدمی ہونے کے ہیں تو پھر جو لوگ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں وہ سب آدمی ہوتے ہیں۔ مگر نہیں ... ایسا نہیں ہے بلکہ آدمی ہونا صفات، اخلاق اور معنوی امور کا ایک سلسلہ ہے گویا یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت انسان ... انسان ہے ... آدمی ہے اور قدر و قیمت اور شخصیت پیدا کرتا ہے۔

آجکل ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کا نام "انسانی قدریں" ہے۔ وہ تمام چیزیں جو انسان کو قدر و قیمت اور شخصیت عطا کرتی ہیں اور اگر وہ نہ ہوتیں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ وہ "انسانی قدریں" کہلاتی ہیں۔

میں نے گزشتہ نشست میں جو کچھ عرض کیا تھا، آج کی نشست میں اس موضوع پر بحث جاری رکھنا چاہتا ہوں:

فرد یا معاشرے میں جو انحرافات پیدا ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم کے انحرافات یہ ہیں کہ انسانی قدروں کی اضداد ان کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ـــ "ظلم" ـــ "عدل" کے مقابلے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ "گھٹن" ـ اور "پابندی" ـــ "آزادی" کے مقابلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ "بے انصافی" اور "بے اعتدالی" ـــ "عدالت" اور "...

کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ "نادانی" اور "حماقت" ـــ "عقل"، "فہم" اور "حکمت" کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔

لیکن شاید انسان کے زیادہ تر انحرافات اس شکل میں نہیں ہوتے کہ قدروں کی ضدیں ان کے مقابل کھڑی ہوں۔ اگر ایسا ہو تو جلد ہی سب ... بلکہ انسان کے بیشتر انحرافات اس شکل میں ہوتے ہیں جیسے سمندر میں مد و جزر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات کوئی ایک انسانی قدر ـــ اس طرح کی مد و جزر جیسی ہوتی ہے اور دوسری قدروں کو اپنے نیچے دبا لیتی ہے۔ ... یہ بجائے خود ایک قدر ہے اور انسانی معیارات میں سے ہے ... لیکن بعض اوقات آپ دیکھتے ہیں کہ ایک فرد یا ایک معاشرہ ... کی جانب اس قدر مائل ہو جاتا ہے اور اس میں اتنا محو ہو جاتا ہے اور اس کے سوا باقی سب کچھ ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا وہ اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جس کا صرف ایک عضو (مثلاً اس کی ناک) بڑھے اور اس کے باقی اعضاء کی ترقی رک جائے۔

اب اس مقدمے کے ساتھ جو میں نے اس نشست میں عرض کیا ہے کہ تمام مکاتب فکر حتی کہ انسان میں جو سب سے زیادہ مادہ پرست ہیں ـــ وہ بھی معنوی قدروں کے ایک سلسلے کے قائل ہیں۔ اس بیان کے ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں:

اصولی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انسانی قدروں کا سب باب ایک عنوان کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے اور پھر خود اس سے تفصیل نکلتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو خود ہمارے عارفوں کی اصطلاح میں اور آجکل کے علماء کی

تحریروں میں بھی آئی ہے۔ بلکہ علمائے عرفان کی اصطلاحات میں آنے سے پہلے یہ ہمارے اسلامی متنوں میں آئی ہے۔ اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسانیت کا اصل معیار وہ چیز ہے جسے "درد رکھنے" یا "صاحبِ درد ہونے" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانیت کا اصل معیار ہے۔

انسان اور حیوان کے درمیان یہی فرق ہے کہ انسان صاحبِ درد ہے اور کم از کم ایک درد رکھتا ہے لیکن جو انسان نہیں ہیں۔ چاہے وہ حیوان ہوں یا ایک سر اور دو کان رکھنے والے انسان کہ جو انسانیت کی روح سے بے بہرہ ہوں، وہ صاحبِ درد نہیں ہوتے۔

اب سب سے پہلے ہمیں خود "درد" کے بارے میں بحث کرنی چاہیے ممکن ہے کہ ابتدا میں یہ بات ذہن کو عجیب سی لگے کہ "درد" کے معنی کیا ہیں؟ درد ایک بری چیز ہے اور ایک ایسی چیز ہے جسے انسان کو اپنے آپ سے دور رکھنا چاہیے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ انسانیت کا معیار اور عظیم ترین قدر "درد رکھنا" ہو؟ درد ایک اچھی چیز ہو سکتا ہے؟ شاید ہم غلطی کر رہے ہیں اور نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس کی حقیقت دریافت کریں۔ مثلاً ایک بیماری، ایک زخم۔ یہ جو چیز بری ہے وہ "اس آفت" جو کہ بیماری اور زخم کا وجود ہے جو بدن پر وارد ہوتی ہے اور بعد میں درد کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ایک انگلی کا کٹ جانا برا ہے، جو درد معدے یا انتڑیوں میں ہو اور انسان اس درد کو محسوس کرے اور .... بالآخر جو چیز انسان کے لیے بری ہے وہ زخم کا وجود ہے کہ جس سے نقصان پہنچتا ہے۔

لیکن خود درد ـــــ اگرچہ وہ انسان کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے مگر وہ انسان کو ایک خرابی سے آگاہ و متنبہ کرتا ہے۔ جب اعضاء میں ـــــ مثلاً انسان کے معدے میں درد ہوتا ہے تو اس بات کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی ہو اور درد وجود میں آجائے۔ اگر درد پیدا ہوتا ہے تو وہ آپ کو خبر دیتا ہے اور مطلع کرتا ہے کہ معدے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس خبر اور آگاہی کے نتیجے میں آپ اس کے علاج کی فکر کرتے ہیں۔ درد حقیقت میں رفتار اور پانی کے درجۂ حرارت کی علامتوں کی مانند ہے جو موٹر کا پانی کم ہو جانے کی نشاندہی کرتا ہے۔ نشاندہی کرنے والی یہ سوئی اچھی چیز ہے لیکن پانی کا کم ہو جانا اور آپ کی موٹر کا گرم ہو جانا اچھی چیز نہیں ہے۔ اگر انسان کے بدن اور معدے میں درد نہ ہوتا اور وہ محسوس نہ کرتا تو اسے اپنی خرابی کی ہمیشگی اطلاع نہ ہوتی اور بعد میں وہ اس خرابی کے علاج کا سوچتا۔ یہ ایک مقررہ حاکم کی طرح انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ علاج معالجے کی فکر کرے۔ کیوں؟ اس لیے کہ "درد" ہے اور یہ تکلیف دہ ہے اس کا علاج ضروری ہے ـــــ لہٰذا درد ایک نعمت ہے۔

عہد و پیمان می کنی کز بعد ازین
جز کہ طاعت نبودم کاری گزین
پس یقین گشت آنکہ بیماری ترا
می ببخشد ہوش و بیداری ترا
پس بدان این اصل را ای اصل جو
ہر کہ را درد است او بردہ است بو

هر که او بیدار تر پر درد تر
هر که او آگاه تر رخ زرد تر

جب تو یہ عہد کرتا ہے کہ اس کے بعد بندگی کے سوا کوئی کام نہ کروں گا۔ اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ لطیفہ تجھے ہوش اور بیداری میں رکھے گی۔

اے طالب حق تو اس حقیقت کو سمجھ لے کہ ایک درد آشنا ہی حق کو پاتا ہے۔ جو زیادہ بیدار ہے وہ زیادہ درد آشنا ہے جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۱۸)

جو شخص دنیا میں زیادہ صاحب درد اور بے درد محسوس کرے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے تو وہ اسی نسبت سے ان سے زیادہ جاننے والا اور زیادہ بیدار ہوتا ہے۔ بے دردی ـــ غافل، بے حسی، بے شعوری اور بے دردی کے برابر ہے، جبکہ دردمندی ـــ آگاہی، بیداری، شعور اور ادراک کے مساوی ہے۔

اگر انسان کا معاملہ ایسا ہو کہ وہ آرام میں ہو لیکن بے درد ہو اور درد محسوس نہ کرتا ہو یعنی جاہل اور بے درد ہو یا یہ کہ وہ ہوشیار ہو اور بیدار درد محسوس کرتا ہو؟ کیا ایک انسان اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ ہوشیار و سمجھدار ہو اور درد محسوس کرے یا اس بات کو ترجیح دے گا کہ وہ بے عقل، کند ذہن اور احمق ہو اور درد کو محسوس نہ کرے؟ گویا کہ ایک ہوشیار و آگاہ شخص کی بے چینی ـــ کسی جاہل، بے خبر اور بے حس شخص

کے آرام اور آسائش پر فوقیت رکھتی ہے۔

ایک مذہب مثل ہے کہ انسان اگر سقراط ہو لیکن بلا چید اور رنجور ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سور کی طرح پلا ہوا ہو یعنی جو شخص سقراط کی طرح دانا اور عالم ہو لیکن آسائش سے محروم ہو تو بھی وہ اس سے بہتر ہے کہ سور کی طرح کھانے پینے کو سب کچھ میسر ہو لیکن وہ کوئی سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری ادبیات میں جو ایک چیز نمایاں ہے، وہ عقل سے شکایت کا مسئلہ ہے۔ ہم نظم و نثر میں اور بالخصوص نظم میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ شعراء نے عقل کی شکایت کی ہے۔ کاش ہم عقل نہ رکھتے ہوتے۔ البتہ عقل سے یہ شکایت ایک مختلف پہلو رکھتی ہے۔ عارفوں کی نظر ایک اور چیز پہ ہے لیکن بہت سے اشخاص نے اس بات پر شکایت کی ہے کہ ہوشیار، حساس اور دانا ہونا انسان سے آسائش سلب کر لیتا ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

دشمن جان من است عقل من و ہوش من
کاش کشادہ نبود چشم من و گوش من

میری عقل اور ہوش میری جان کے دشمن ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میری آنکھ اور کان ـــ دیکھنے سننے سے محروم ہوتے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

عاقل مباش تا غم دیوانگاں خوری
دیوانہ باش تا غم تو عاقلاں خورند

تو عاقل مت بن کہ تجھے دیوانوں کے غم کی مار سہنی پڑے بلکہ دیوانہ ہو جا کہ عقل مند

تیری شکوہ کب کریں

یعنی وہ "جنون کی بے فکری و آسائش" کو "عقل کی فکرمندی و ناراحتی" پر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ و گفتار سراسر غلط ہے، کیونکہ جو شخص انسانیت کے مقام پر پہنچ جائے اور صاحب "درد" اور "دردمندی" کی قدر و قیمت کو سمجھ گیا ہو وہ ہرگز یہ نہیں کہتا:

"دشمن جان من است عقل من ہوش من"

بلکہ وہ رسول اکرمؐ کی یہ حدیث نقل کرتا ہے:

"ہر شخص کا سچا دوست اس کی عقل و ہوش ہے اور
ہر شخص کا حقیقی دشمن اس کی جہالت اور نادانی ہے۔"

(وسائل الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۱)

جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ عقل و ہوش میری جان کے دشمن ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہالت اور نادانی سے پیدا ہونے والی پریشانیوں اور مصیبتوں کو محسوس نہیں کرتا، ورنہ وہ ہرگز یہ بات نہ کہتا ــــ لہٰذا درد اور درد کا احساس اچھی چیزیں ہیں۔ اگر صورت یہ ہو کہ انسان کے اندر "درد کا موجب" نہ ہو اور انسان درد نہ رکھتا ہو تو "درد کا موجب" نہ رکھنے کی بنا پر درد نہ رکھنا درد رکھنے سے بہتر ہے لیکن اگر درد کا موجب موجود ہو، خرابی موجود ہو اور اس کی بنیاد موجود ہو، مگر انسان درد کا احساس نہ کرے تو یہ بے خبری، بیچارگی اور بدبختی ہے۔ لہٰذا جسمانی بیماریوں میں سے جو بھی بیماری شروع اور ابتدا میں اس کا درد محسوس نہ ہو تو وہ مہلک ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ابتدا میں ہی درد کا موجب ظاہر ہو جائے اور انسان درد کا احساس

کرے تو ممکن ہے کہ اس کا علاج کر لیا جائے یا کم از کم اس سے پیشتر کہ وہ جراثیم خون میں داخل ہوں اسے آپریشن کے ذریعے نکال دیا جائے۔ اس بیماری سے اس بنا پر زیادہ خطرہ ہے کہ وہ بے خبری کے عالم میں یعنی درد کے بغیر وارد ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانیت کی قدروں میں سب سے بڑی قدر "درد رکھنا" ہے یا درد بری چیز ہے اور اس کا علاج کرنا چاہیے نہیں ــــ ایسا نہیں ہے اور درد اچھی چیز ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ انسان کا درد کیا ہے؟ آدمی کے سر میں درد ہوتا ہے لیکن اس بنا پر درد انسان ہے، وہ درد انسان کا نہیں ہے کیونکہ ایک حیوان کے سر میں بھی درد ہوتا ہے۔ انسان کے ہاتھ میں درد ہوتا ہے، انسان کے پاؤں میں درد ہوتا ہے اور...... تاہم یہ تو حیوانی عضوی اور شخصی درد ہیں جو مشترک درد ہیں لیکن وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ "انسان کا درد" ــــ اس سے "صاحب درد ہونا" ہے۔ ان کی مراد یہ جسمانی درد نہیں ہے بلکہ ایک اور چیز ہے۔ ہاں ــــ وہ درد جو انسان اور انسانیت کی قدروں میں سب سے بڑی قدر ہے، وہ اس درد سے ایک مختلف چیز ہے۔

خود ہمارے عارفوں کی طرح ایک اور گروہ بھی انسان کے بارے میں جس درد کا اقرار کرتا ہے وہ یہی "درد" ہے۔ وہ لوگ اسے مقدس قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ انسان کے امتیازات میں سے ہے۔ بلکہ انسان اس بنا پر فرشتے پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ فرشتہ بے درد ہے اور انسان درد رکھتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جسے عارف لوگ "خدا کی تلاش کا درد"

کہتے ہیں لیکن یہ فقط نفی کا نظریہ نہیں — اس درس میں اصلاح کا نظریہ بھی بھی ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان ایک ایسی حقیقت ہے جو عالمِ علوی سے وجود میں آئی ہے۔ انسان ایک دوسری دنیا سے آیا ہے۔ وہ اس دنیا کی فطری چیزوں کے ساتھ مکمل یک رنگی نہیں رکھتا۔ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کے تمام موجودات کے ساتھ اپنی اجنبیت، بیگانگی اور عدم مطابقت کو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سب فانی و متغیر ہیں۔ لہٰذا دل لگانے کے قابل نہیں ہیں بلکہ انسان میں جاودان بن جانے کا ایک داعیہ وجود رکھتا ہے۔ پس یہی وہ درد اور یہی وہ قوت ہے جو انسان کو خدا پرستی، عبادت گزاری اور اس سے راز و نیاز کرنے نیز اس کے نزدیک ہونے کی جانب کھینچتی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے عرفان میں اس موضوع پر کیسی کیسی مثالیں آئی ہیں۔ بعض اوقات ایک طوطے کی مثال دی جاتی ہے جس کو ہندوستان کے جنگلوں سے لایا گیا اور دوسرے طوطوں سے الگ کر کے ایک پنجرے میں قید کر دیا گیا۔ پھر یہ حیوان اداس رہتا ہے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ یہ پنجرہ ٹوٹ جائے اور وہ لوٹ کر اس جگہ چلا جائے جو اس کا اصلی وطن ہے۔

کبھی اسے ایک ایسے پرندے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو اپنے گھونسلے سے دور جا پڑا ہو۔ اس طرح کی بہترین تشبیہوں میں سے ایک تشبیہ خود مولوی معنوی کی ہے۔ انہوں نے مثنوی کی ابتدا میں ہی اسے اس بنسری کی نَے سے تشبیہ دی ہے جسے جنگل سے کاٹا گیا ہے۔ وہ مسلسل

نالہ و فریاد میں یہ کہہ رہی ہے کہ اپنی اصل سے جدا ہو گئی ہے:

بشنو از نی چوں حکایت می کند
واز جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں چوں مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق
دو دہاں داریم گویا ہمچو نی
یک دہاں پنہانست در لبہای وی

بنسری سے سنو کہ وہ اپنے فراق کی بات بتا رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے جنگل سے کاٹا گیا اور میری آواز پر سب روتے ہیں۔ میرا دل درد فراق سے ٹکڑے ٹکڑے ہو تاکہ میں اپنی محبت کا قصہ سناؤں۔ بنسری کی طرح ہمارے دو منہ ہیں اور ایک اس کے ہونٹوں میں پوشیدہ ہے۔

(مثنوی مولانا روم۔ ابتدائی اشعار)

اس کے علاوہ اسے ہاتھی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ جیسے ایک مشہور داستان میں کہا گیا ہے کہ ہاتھی عموماً ہندوستان سے لایا جاتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے سر پر مسلسل ضربیں لگائی جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ہاتھی اپنے اصل وطن ہندوستان کو یاد کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی کہتے ہیں:

پیل باید تا چو خسپد اوستان
خواب بیند خطۂ ہندوستان
خر نبیند ہیچ ہندوستان بہ خواب
خر ز ہندوستان نکردہ است اغتراب

ہاتھی جب اپنے استھان پر ہوتا ہے تو ہندوستان کے خواب دیکھتا ہے۔

گدھا ہندوستان کے خواب نہیں دیکھتا کیونکہ وہ وہاں سے نہیں نکلا ہے (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۲۰۰)

یعنی یہ فقط ہاتھی ہی ہے جو خواب میں ہندوستان کو دیکھتا ہے، کیونکہ وہ ہندوستان سے آیا ہے۔ گدھا ہرگز ہندوستان کو خواب میں نہیں دیکھتا کیونکہ اسے ہندوستان سے نہیں لایا گیا اور وہ اپنے وطن سے دور نہیں ہوا۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان عرفانی درد کی بدولت دوسری دنیا کی جانب لوٹ جانے کی کسک رکھتا ہے۔ درد اسے حق کی جانب اور خدا کی طرف رجوع ہونے پر مائل کرتا ہے۔ وہ خدا سے مناجات کرنے اور اپنے خالق سے وصل کا درد رکھتا ہے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام نے کیا عمدہ بات کہی ہے۔ ایک دن آپ نے اپنے صحابی کمیل بن زیاد نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑا اور قبرستان کی جانب لے چلے۔ جب کچھ دیر بعد آپ آبادی سے باہر نکل گئے تو ایک مسلسل آہ کھینچ کر بولے:

"اے کمیل! یہ دل اسرار و حکمت کے ظروف ہیں۔ ان میں

سب سے بہتر وہ ہے جس کی ظرفیت زیادہ ہو۔ یہ وہ بہتر نگہداشت کرنے والا ہو۔"

اس کے بعد مولا امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا: اے کمیل! جو بات میں تمہیں بتا رہا ہوں اسے دھیان سے سننا اور یاد رکھنا۔ بعد ازاں امیرالمومنین دنیا کے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر بے کلام کے آخر تک پہنچتے ہیں ـــــ اور شکایت کرتے ہیں: افسوس! ـــ راز حقیقت کے سننے اور سمجھنے والے افراد موجود نہیں کہ میں ان کو اپنے اس کی بات بتاؤں اور اپنا یہ درد دل ان پر ظاہر کر سکوں...... پھر فرماتے ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی دانشمند نہ ہو۔ کیونکہ ہمیشہ دنیا زمانے میں ایسے کچھ نہ کچھ افراد موجود ہوتے ہیں۔

"ہاں! مگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں جو کہ خدا کی حجت کو برقرار رکھتا ہے۔ چاہے وہ ظاہر و مشہور ہو یا خائف و پنہاں، تاکہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں ـــــ اور وہ ہیں ہی کتنے اور کہاں پر ہیں! خدا کی قسم، وہ تو گنتی میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور اللہ کے نزدیک قدر و منزلت میں بہت بلند۔ خداوند عالم ان کے ذریعے سے اپنی حجتوں اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کو اپنے جیسوں کے سپرد کر دیں اور اپنے جیسوں کے دلوں میں انہیں بو دیں۔ علم نے انہیں ایک دم حقیقت و بصیرت کے انکشافات تک پہنچا دیا ہے۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، حکمت ۱۴۷)

وہ اس طرح کے شخص ہیں کہ علم حقیقی نے انتہائی بصیرت کے ہمراہ ان کو اپنے دامن میں لے لیا ہے اور وہ یقین کامل کے معیار پر پہنچ گئے ہیں۔

"وہ یقین و اعتماد کی روح سے گھل مل گئے ہیں اور ان چیزوں کو جنہیں آرام پسند لوگوں نے دشوار قرار دے رکھا تھا اپنے لیے سہل و آسان سمجھ لیا ہے اور جن چیزوں سے جاہل بھڑک اٹھتے ہیں، ان سے جی لگائے بیٹھے ہیں۔"

(نہج البلاغۃ مفتی جعفر حسین۔ حکمت ۱۴۷)

انہوں نے "یقین کامل" کی روح کے ساتھ اطمینان پیدا کر لیا ہے اور اس کے ساتھ ملے جلے ہو گئے ہیں گویا روح یقین کے اور ان کے بیچ میں اب کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ وہ چیزیں کہ جو اہل طرب اور مادہ پرستوں کے لیے بے حد سخت ہیں، وہ ان کے لیے سہل اور نرم ہیں۔ جو چیز یعنی خدا کے ساتھ خلوت، ان مادہ پرستوں کے لیے وحشت کا موجب ہے وہ ان کے لیے مایۂ انس و رفق ہے۔

"وہ ایسے جسموں کے ساتھ دنیا میں رہتے ہیں کہ جن کی روحیں ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہیں۔"

(حوالۂ سابق)

وہ دنیا میں لوگوں کے ہمراہ ہیں لیکن ایسی روحوں کے ساتھ کہ جن کا تعلق ایک ماورائی عالم سے ہے۔ وہ اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں نہیں —— حالانکہ وہ اس دنیا میں ہیں مگر وہ دوسری دنیا میں بھی ہیں۔ یہ ہیں علی" اور یہ ہیں علی کے درد یعنی علی کا درد عرفان

علی" کا درد عبادت میں ان کی مناجاتیں اور......

ایک اور مسئلہ جو بڑا ظاہر اور واضح ہے کہ عبادت میں آپ کا جذبہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ آپ بے خود ہو جاتے تھے۔ آپ اپنے محبوب اور معشوق خدائے عزوجل کی بارگاہ میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ آپ کے اردگرد خواہ کچھ بھی ہو جاتا —— اس کی انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ اگر آپ کے بدن سے تیر بھی کھینچ لیا جائے تو آپ کو احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

یہ انسان کا درد ہے، یہ حق تعالیٰ سے جدائی، اس کی ذات سے تقرب کی آرزو اور اشتیاق، اس کی جانب حرکت اور اس کے نزدیک ہونے کا درد ہے۔ کیونکہ جب تک انسان ذاتِ حق تک نہیں پہنچ جاتا، اس کی یہ بے چینی اور یہ اضطراب زائل اور برطرف نہیں ہوتا اور اس کی یہ بے چینی اور اضطراب کی حالت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو کسی چیز یا کسی عمل میں مشغول کر لیتا ہے تو یہ محض ایک دل بہلاوا ہوتا ہے اور اس کی حقیقت کوئی اور چیز ہے جسے قرآن مجید ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

"...جان لو کہ دل فقط ایک چیز کے ذریعے سے ہی سکون پاتے ہیں اور وہ اللہ کا ذکر ہے۔"

(سورۂ رعد۔ آیت ۲۸)

یعنی انسان کا یہ درد صرف ایک ہی چیز سے آرام حاصل کر سکتا ہے اور وہ یادِ حق میں مشغول ہونا اور پروردگار کی ذات سے انس پیدا کرنا ہے۔ پس یہ ہے انسان کے دردوں میں سے ایک درد!

عارفوں نے زیادہ تر اس ایک درد پر تکیہ کیا اور کسی دوسرے درد کی جانب توجہ نہیں دی یا بہت کم توجہ دی ہے۔

مولوی معنوی کہتے ہیں:

حسرت و زاری کہ در بیماری است
وقت بیماری ہمہ بیداری است
ہر کہ او بیدارتر پر دردتر
ہر کہ او ہشیارتر رخ زردتر
پس بدان این اصل را ای اصل جو
ہر کرا درد است او بردہ است بو

بیماری میں گریہ و زاری ہوتی ہے، اس لیے وہ انسان کو بیدار رکھتی ہے۔

جو زیادہ بیدار ہے وہ زیادہ درد آشنا ہے اور جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ پریشان ہے۔

اے طالب حق تو اس حقیقت کو سمجھ لے کہ ایک دردمند ہی حق کو پاتا ہے۔

مولوی معنوی نے ایک داستان نقل کی ہے جو مجھے ابھی یاد آئی ہے اور اگر میں اسے بیان نہ کروں تو میرے لیے افسوس کی بات ہوگی۔

یہ ایک تمثیل ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

ایک آدمی تھا جو ہمیشہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں رہتا اور اللہ ـــ اللہ ـــ کا ذکر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شیطان اس کے

سامنے آیا اور وسوسے میں ڈال گیا۔ اس نے کچھ ایسا کام کیا کہ یہ آدمی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

ہوا یہ کہ شیطان اس کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے شخص! یہ جو تم اللہ ـ اللہ ـ کرتے رہتے ہو ـــ روزانہ صبح کے وقت جاگ اٹھتے ہو اور بڑے درد کے ساتھ اللہ کے نام کا ورد کرتے ہو تو کیا ایک بار بھی ایسا ہوا کہ تم نے لبیک کا لفظ سنا ہو؟ اگر تم کسی کے گھر گئے ہوتے اور اتنی آہ و زاری کی ہوتی تو کم از کم ایک بار تو تمہیں جواب ملتا اور تمہاری آواز پر لبیک کہی جاتی۔ اس آدمی نے دیکھا کہ بظاہر بات سچی ہے۔ شیطان کی یہ بات اس امر کا موجب بنی کہ اس آدمی کا منہ بند ہوگیا اور اس نے اللہ اللہ کرنا چھوڑ دیا۔ پھر عالم رؤیا میں ہاتف نے اس سے پوچھا کہ تم نے اپنی مناجات کیوں ترک کر دی؟

اس نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ میری اس تمام مناجات اور اس تمام درد اور سوز کے باوجود ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے جواب میں لبیک کہی گئی ہو۔

ہاتف نے کہا: لیکن میں اس کام پر مامور ہوں کہ تمہیں خدا کی طرف سے جواب دوں:

گفت ہمان اللہ تو لبیک ماست
آن نیاز و سوز و دردت پیک ماست

یعنی ہاتف نے اس شخص سے کہا کہ یہی درد، یہی سوز اور یہی عشق اور شوق جسے ہم نے تمہارے دل میں قرار دیا ہے وہ ہماری طرف سے لبیک ہے

ایک بھیک ہے۔

اب غور کیجیے کہ امام علیؑ دعائے کمیل میں کیا عرض کرتے ہیں:

اے خدا! میرے سب تمام گناہوں کو بخش دے جو اس
بات کا سبب بنتے ہیں کہ میں دعا کرنے سے باز رہوں، اور وہ
اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ دعا درجۂ اجابت کا درد
مجھ سے چھین جائے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دعا انسان کے
لیے مطلوب بھی ہے اور وسیلہ بھی ہے، یعنی دعا ہمیشہ قبول
ہونے کے لیے نہیں ہوتی کیونکہ دعا اگر قبول نہ بھی ہو تو بھی
وہ بجائے خود انسان کا مطلوب ہے۔

کچھ اور لوگ جو درد کو ایک عظیم انسانی قدر تسلیم کرتے ہیں، وہ انسان کے درد کے بارے میں ایک اور چیز کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہے انسان کا درد "خلق خدا کی نسبت سے" نہ کہ انسان کا درد "خدا کی نسبت سے"۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے درد رکھتا ہو، یعنی وہ تکلیفیں جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور وہ اسے نہیں بلکہ کسی دوسرے کو پہنچ رہی ہیں، وہ اس کے دل میں درد پیدا کریں اور بقول سعدی وہ دوسروں کا غم خوار رہے:

من از بے نوائی نیم رنگ زرد
غم بے نوایان رخم زرد کرد

میرا رنگ تنگدستی سے زرد نہیں ہوا، بلکہ تنگدستوں کے غم نے میرا چہرہ زرد کر دیا ہے۔

یہ بھی ایک درد ہے ۔ اور اگر انسان کے دل میں دوسروں کے لیے درد پیدا ہو جائے تو اس سے غم خواری پیدا ہوتی ہے، یعنی دوسرے لوگ دکھی ہوں تو اسے نیند نہیں آتی۔ وہ دوسرے کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا دیکھتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کانٹا خود اس کی آنکھ میں جا گڑا ہو۔ یہ درد ۔ انسان کا وہ درد ہے ۔ جو اس کو شخصیت اور قدر و قیمت عطا کرتا ہے اور یہی تمام انسانی قدروں کا سرچشمہ ہے۔

"مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ "خلق خدا کی نسبت سے" کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ وہ گفتگو کے دوران کسی دوسرے معاملے پر اس نسبت کو یاد نہیں کرتے۔ یہ وہ چیز جس کی سرگشت انسان کے اس احساس ذمہ داری کی بات ہو تو وہ دوسرے انسانوں کے لیے رکھتا ہو۔ وہ دوسرے انسانوں کے لیے انسان کا درد ہے۔ وہ لوگ اسے انسانی قدر سمجھتے ہیں، مگر اصل میں یہی انسانی قدروں کا کسی ایک قدر میں منحصر ہو جانا اور محدود ہو کر رہ جانا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے؟

اسلام اور اسلامی معیارات کے لحاظ سے ایک ایسا شخص انسان ہے جو دوسروں کا درد رکھتا ہو؟ یا وہ شخص جو فقط خدا کی محبت کا درد رکھتا ہو؟ یا وہ شخص جو خدا کی محبت کا درد رکھتا ہو اور خدا کا درد رکھنے کی وجہ سے دوسرے انسانوں کا درد بھی رکھتا ہو؟ ان تینوں میں سے اصلی درد کونسا ہے؟

اب آپ دیکھیں کہ قرآن مجید کس لحاظ سے بات کر رہا ہے، جبکہ

رسول اکرمؐ کے بارے میں کہتا ہے:

"تو اے رسولؐ! اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو شاید تم مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنی جان دے ڈالو گے۔"

(سورۂ کہف۔ آیت ۶)

دنیا کی ہدایت، خوش بختی کے لیے اور انہیں دنیا و آخرت کی مشکلوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کے لیے ــــ پیغمبر اتنے حریص ہیں کہ اس میں اپنے آپ کو مار ڈالنا اور ہلاک کر دینا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید کی یہ ایک اور بہت بڑی حیثیت کہ آخر کیا بات ہے؟ آپ لوگوں کی خاطر اپنی جان کیوں ہلکان کرتے ہیں؟

"اے طٰہٰ (رسولؐ!) ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم اس قدر مشقت اٹھاؤ۔ مگر جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس کے لیے نصیحت ہے۔"

(سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱ تا ۳)

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

"لوگو! تم ہی میں سے تمہارا ایک رسولؐ تمہارے پاس آچکا ہے، اس پر شاق ہے کہ تم تکلیف اٹھاؤ اور اسے تمہاری بہتری کی فکر ہے۔ وہ ایمانداروں پر حد درجہ شفیق ہے۔"

(سورۂ توبہ۔ آیت ۱۲۸)

دیکھیے قرآن مجید کی تعبیر کیسی لطیف ہے۔ اے لوگو! تمہارے درمیان میں سے اور تمہاری جنس میں سے تمہارے لیے ایک پیغمبر آیا ہے۔ اس کی

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ "عزیز علیہ ما عنتم" "عنت" یعنی تمہاری مشکلیں، تکلیفیں اور پریشانیاں اسے ناگوار ہیں۔ کیونکہ وہ تمہارا درد رکھتا ہے۔ ہاں تو تمہارا پیغمبر وہ شخص ہے جو تمہارا درد رکھتا ہے۔ پس مسلمان بھی وہی شخص ہے جو خلق کا درد بھی رکھتا ہو۔

اب رہا یہ جملہ کہ "وہ تم پر حریص ہے"۔ اس کی تشریح کچھ یوں ہے، جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض باپ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے پڑھ لکھ جائیں ــــ پھر وہ ان کی پڑھائی پر بہت سا خرچ بھی کرتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس بات پر حریص ہے کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ جائے۔ گویا جس طرح باپ اپنے بیٹے کی تعلیم پر حریص ہوتا ہے اور ایک آدمی دنیا کے مال پر حریص ہوتا ہے، نبی اس سے بھی بڑھ کر ــــ پیغمبر لوگوں کی ہدایت کے حریص ہیں اور لوگوں کی مشکلوں اور مصیبتوں کو ان سے دور کرنے کے حریص ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خود امام علی علیہ السلام بھی درد کی یہی تعبیر نہیں کرتے؟ جب کہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ بصرہ میں عثمان بن حنیف نے ایک دعوت طعام میں شرکت کی ہے۔ اس دعوت میں کیا بات تھی؟ کیا وہاں شراب پی گئی، جوا کھیلا گیا، فسق و فجور کا ارتکاب ہوا؟ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر کیا ہوا؟ اس دعوت کی برائی در حقیقت یہ تھی کہ اس میں سو فیصد اونچے طبقے کے لوگ شامل تھے۔ غریبوں میں سے کوئی نہ تھا۔ چنانچہ جب امام علیؑ کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے ان کو خط لکھا: عامل! تم نے ایک ایسی دعوت میں شرکت کی ہے کہ جس میں صرف امیر لوگ

شامل تھے اور فقراء میں سے کوئی نہیں تھا ـــــ ہاں تو آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کیا فرمایا؟

آپ نے فرمایا:

۳۷ـ مجھے امید نہ تھی کہ تم ان لوگوں کی دعوت قبول کرو گے کہ جن کے یہاں فقیر و نادار دھتکار دیے گئے ہوں اور دولت مند مدعو ہوں۔ (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین، مکتوب ۴۵)

پھر آپ اپنے دردوں کو بیان کرنا شروع کرتے اور فرماتے ہیں:

۳۸ـ اگر میں چاہتا تو صاف ستھرے شہد، عمدہ گیہوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کے لیے ذرائع مہیا کر سکتا تھا۔ لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنا لیں اور حرص مجھے لے چلے۔ (حوالۂ سابق)

غور کیجیے کہ امام علیؑ یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اچھا لباس پہننا یا اچھی غذا کھانا حرام ہے، نہیں ـــــ مسئلہ یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے، ورنہ علیؑ کیوں کہتے ہیں کہ ہیہات......؟

اس کے بعد فرماتے ہیں:

۳۹ـ شاید کہ حجاز و یمامہ میں ایسے لوگ ہوں جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو اور انہیں پیٹ بھر کر کھانا کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں شکم سیر ہو کر سوتا رہوں؟ جب کہ میرے گرد و پیش بھوکے پیٹ، لوگ موجود ہوں۔

(حوالۂ سابق)

کیا میں ایسا بن جاؤں جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

۴۰ـ یعنی تنہا یہی درد تیرے لیے کافی ہے کہ تو پیٹ بھر کے سوتا رہے اور تیرے ارد گرد بھوکے لوگ موجود ہوں۔

(حوالۂ سابق)

اسے کہتے ہیں "خلق خدا کا درد" ـــ اسے کہتے ہیں "حب انسانیت" اور اسی کو تم "انسانی قدروں کی ماں" کہتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ کامل انسان ـــ علیؑ کیا کہہ رہے ہیں:

۴۱ـ کیا میں اسی میں مگن رہوں کہ مجھے "امیر المومنین" کہا جاتا ہے۔ مگر میں زمانے کی سختیوں میں مومنوں کا شریک و ہمدم نہ بنوں۔ (حوالۂ سابق)

کیا میں اپنے اس لقب اور اس قدر پر قناعت کروں؟ کیا میں اس بات پر قناعت کروں کہ مجھے "امیر المومنین" کا لقب دیا جاتا ہے اور خلیفہ و رئیس کہا جاتا ہے لیکن زمانے کی سختیوں میں مومنوں کے ساتھ شرکت نہ کروں؟ آپ دیکھیں کہ یہ تمام باتیں دوسروں کے درد کا احساس کرنے کے بارے میں ہیں۔ جو درد انسان دوسروں کے لیے رکھتا ہے، اس میں لذت ہوتی ہے۔ دوسروں کا درد رکھنے کی اس لذت میں کیا راز ہے؟ یہ بات خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اسی ضمن میں بوعلی سینا نے "اشارات" کے آخر میں بطور مثال "بدن کی ورزش" کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان بدن کو کھپاتا ہے تو اسے درد تو ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے ایک لذت بھی

حاصل ہوتی ہے اور بدن کا کھچاؤ اسے اچھا لگتا ہے۔ یہ درد ہے لیکن "درد تلخ" نہیں ہے ــــ یہ درست ہے کہ وہ دل کو جلاتا ہے اور آنسو بھی نکالتا ہے لیکن یہ غم اور یہ درد محبوب اور مطلوب ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان ہمیشہ رنج و غم سے دور رہنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اسے کہے کہ فلاں جگہ حضرت سید الشہداء کی مجلس بپا ہے "آؤ میرے ساتھ چلو کہ وہاں کچھ آنسو بہائیں" تب وہ پوری رضامندی کے ساتھ ایسی مجالس میں شریک ہوتا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کا دل نہ جلے وہ آنسو نہیں بہاتا چونکہ مجلس سید الشہداء میں ان کے مصائب پر اس کا دل جلتا ہے اس لیے وہ آنسو بہاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس مجلس میں حالت غم کے ساتھ جائے، اس درد کو محسوس کرے اور پھر آنسو بہائے ــــ جب آنسوؤں کے یہ قطرے ٹپکتے ہیں تو انسان ایک قسم کا اطمینان محسوس کرتا ہے۔ تاہم اس دل کا حال ہوا اور یہی دستور رہے اور یہ ایک روح سب کا درد محسوس کرتی ہے۔ اس لیے آسائش کے تمام امکانات فراہم ہونے کے باوجود وہ اس بات پر تیار ہے کہ جو کی روٹی پر گزارہ کرے مبادا کہ حجاز یا یمامہ کے کوئی شخص بھوکا سو جائے۔ وہ پیوند لگے جوتے پہنتے ہیں تاکہ وہ علیؑ کی روح کے ساتھ مطابقت رکھ سکے

بقول اس شاعر کے کہ جو کہتا ہے کہ جب روح بڑی ہو جاتی ہے تو جسم تو ہے اس روح کے حال پر ــــ کیونکہ جب روح بڑی ہو جاتی ہے تو سب بدنوں کی طرح بن جاتی ہے اور سب کا درد محسوس کرتی ہے تو اس کا مداوا اشکین ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ایک بیوہ عورت اور چند یتیم بچوں سے

حالت سے غافل رہنے پر دکھی اور غمگین ہوتی ہے۔ جیسے روایت میں ہے کہ امام علیؑ ایک گلی میں تشریف لے جاتے ہیں اور ایک عورت کو دیکھتے ہیں جو ایک مشک اٹھائے ہوئے جا رہی ہے۔ کیا علیؑ ایسے منظر سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں؟ جب آپ یہ منظر دیکھتے ہیں تو آپ کے دل میں درد اٹھتا ہے۔ یہ کیوں ہو؟ اس وجہ سے نہیں کہ ایک عورت جو خود پانی بھر کر لاتی ہے یقیناً اس کا کوئی نہیں اور کوئی ہے بھی تو اس کی مدد نہیں کرتا۔ آپ علیؑ آگے بڑھتے ہیں اور بڑے ادب سے فرماتے ہیں:

خاتون! کیا آپ مجھے اجازت دیتی ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں؟

بالآخر آپ اس کی مدد کرتے ہیں اور اس کے گھر پہنچتے ہیں پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ بتا سکیں گی کہ آپ خود کیوں پانی بھرتی ہیں؟

وہ بتاتی ہے۔ جی ہاں! اتفاق ایسا ہوا کہ میرا شوہر علی ابن ابی طالبؑ کی معیت میں مارا گیا اور اب میرا کوئی سرپرست نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ الفاظ سن کر امام علی علیہ السلام بے حد مضطرب ہوئے اور اس رات جب آپ گھر گئے تو رات بھر نہیں سوئے اور صبح ہوتے ہی آپ اور آپ کے رفقاء گوشت روٹی اور کھجوریں لے کر اس عورت کے گھر پہنچے وہاں پہنچ کر آپ نے جتنی جلدی ہو سکا اپنے مبارک ہاتھوں سے گوشت بھونا اور ان یتیم بچوں کو کھلایا۔ پھر آپ نے ان کو انتہائی شفقت سے گود میں بٹھایا اور آہستہ سے فرمایا: علیؑ جو تم سے غافل رہا ہے اس کی تقصیر معاف کر دو۔ اس کے بعد آپ نے تنور جلایا اور اس کے نزدیک گئے۔ جب آگ کی تپش محسوس ہوئی تو اپنے آپ سے کہا: اے علیؑ! دنیا کی اس

آگ کی تپش کا مزہ چکھو اور دوزخ کی آگ کو یاد کرو، تاکہ تم عام لوگوں، یتیموں اور
بیکسوں کے حال سے غافل نہ رہو۔

اے پروردگار! ہم تجھے امام علی علیہ السلام کے حق کی قسم دیتے ہیں کہ
ہمارے دل میں اسلام کا درد پیدا کر دے۔ اے خدا! ہمارے دلوں میں اپنی
محبت، اطاعت اور عبادت کا درد رکھ دے۔ ہمارے اندر اپنی مخلوق کے لیے
ہمدردی کا احساس پیدا فرما دے۔ اے رب کریم! ہمیں امام علی علیہ السلام
کی ولایت کے نور سے منور فرما اور اس بزرگوار کا حقیقی پیرو بنا۔ الٰہی!
دلوں کو نور ایمان سے منور کر دے اور ہمارا خاتمہ بخیر ہو۔ آمین۔

چوتھی نشست

خود شناسی، خدا شناسی کی تمہید ہے

﴿ اور (مشکل کے) وقت صبر اور نماز کا سہارا پکڑو اور یہ
(نماز) بھاری تو ہے مگر فروتنی کرنے والوں پر نہیں۔

(سورہ بقرہ آیت ۴۵)

ہمیشہ سے خود انسان ہی اپنے لیے معنویت کا دروازہ رہا ہے۔ یہ ایسا
دروازہ ہے جس سے انسان معنویت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے اور علوم معنوی
کی تہہ حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ قدیم و جدید سب علمائے علم نفس نے کہا ہے۔
امیر المومنین مولی الموحدین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
﴿ جو شخص اپنی ہستی کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے پروردگار کو پہچان لیتا ہے۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

قرآن مجید نے اصولی طور پر انسان سے بحیثیت معنوی موجود کے تقاضے

میں ایک الگ باب کھولا ہے، کیونکہ انسان ایک الگ اور مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن مجید کی یہ تعبیر ملاحظہ کریں کہ وہ کہتا ہے:

"عنقریب ہم اپنی نشانیاں اطراف میں اور خود ان کے نفسوں میں بھی دکھا دیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا۔ کہ وہی یقیناً حق ہے۔ کیا تمہارے پروردگار کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔"

(سورہ حٰم سجدہ۔ آیت ۵۳)

ہم اپنی نشانیاں آفاق میں یعنی بیرونی دنیا میں اور خود لوگوں کے نفوس میں دکھاتے ہیں۔ اس بات کو قرآن مجید نے ایک الگ اسلوب اور الگ انداز سے بیان کیا ہے۔ یہی آیت اس امر کا موجب بنی کہ ہمارے ادبیات میں "آفاق" اور "انفس" کی مخصوص اصطلاحیں وجود میں آئیں، جن کے تحت "آفاقی مسائل" اور "انفسی مسائل" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اب ممکن ہے کہ آپ یہ پوچھیں کہ انسان اور انسان کے نفس میں وہ کونسی چیزیں موجود ہیں جن کی توجیہہ مادی قوتیں نہیں کر سکتیں؟ یہ ایک طویل داستان ہے اور بالتفصیل ہم اسے بیان نہیں کرنا چاہتے۔

جو چیزیں مادی قوتوں سے مطابقت نہیں رکھتیں ان میں سے ایک انسانی قدروں کا مسئلہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ انسان کی انسانیت کا مسئلہ ہے اور یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ جس موجود کو بھی دیکھیں آپ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک صفت کے طور پر خود

اپنے آپ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم چیتے کے لیے چیتاپن کی صفت کا، کتے کے لیے کتاپن کی صفت کا اور گھوڑے کے لیے گھوڑاپن کی صفت کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں کوئی ایسا چیتا نہیں مل سکتا جس میں چیتاپن نہ ہو، کوئی ایسا کتا نہیں مل سکتا جس میں کتاپن نہ ہو اور کوئی ایسا گھوڑا نہیں مل سکتا جس میں گھوڑاپن نہ ہو لیکن یہ انسان ہے کہ ممکن ہے وہ ایک انسان ہو جس میں انسانیت نہ ہو۔ کیونکہ جن چیزوں کو ہم انسان کی انسانیت سمجھتے ہیں اور جو چیزیں انسان کو انسانیت عطا کرتی ہیں نہ کہ وہ چیزیں جو کسی شخص کا معیار ہیں بلکہ وہ چیزیں جو کسی شخص کا معیار ہیں، یہی بات ہے کہ ان چیزوں کا ایک حصہ ہے جو انسان کے مادی ڈھانچے سے نہیں بنتیں کیونکہ یہ غیر مادی ہیں اور نہ تو محسوس ہوتی ہیں اور نہ چھوئی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ وہ انسانی بنیادیں ہیں اور اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں مگر اس کے باوجود نہ تو انسان انہیں محسوس کر سکتا ہے اور نہ ہی چھو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مادیت کے زمرے میں نہیں بلکہ معنویات کے زمرے میں آتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ چیزیں جو انسان کی انسانیت کا معیار ہیں انسان کو شخصیت اور حیثیت بخشتی ہیں اور انسان کی انسانی شخصیت کا پیمانہ ہیں۔ وہ فطرت کے ہاتھوں یا کسی کے ہاتھوں بھی نہیں بنتیں۔ وہ صرف اور صرف خود انسان کے ہاتھوں بنتی ہیں۔ مختصر انسان خود معنویت کا دروازہ ہے اور خود اپنے وجود کے دروازے سے عالم معنیٰ تک پہنچتا ہے۔

آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"جو کچھ وہاں ہے اسے پہچانا نہیں جا سکتا ــــــ مگر

اس کے ذریعے سے جو کچھ ملا ہے، جب کہ یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے......

وہ چیزیں جنہیں انسانی قدریں کہا جاتا ہے اور جو انسان کی معنویت اور انسانیت کا معیار ہیں۔ وہ بہت سی ہیں لیکن ان تمام قدروں کو ایک قدر میں سمویا جا سکتا ہے اور وہ قدر "درد رکھنا" اور "صاحب درد" ہونا ہے۔

ہر وہ مکتب جس نے دنیا میں انسانی قدروں کے بارے میں بحث کی ہے اس نے اس حقیقت کی جانب توجہ دی اور انسان میں ایک درد کا تعین کیا ہے جو مختلف انسانی دردوں یا مادی رجحانات کے دردوں سے ماوراء ہے۔ وہ درد کیا ہے؟ انسان کا وہ انسانی درد کیا ہے؟ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بعض لوگوں نے لفظ اس درد میں انسان کی غریب الوطنی اور اس وطن کے ساتھ اس کے عدم تجانس اور بیگانگی کے درد پر تکیہ کیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان ایک ایسی حقیقت موجود ہے جو کسی اور دنیا سے ایک شخص فرض کر لیا گیا اور اپنے اصل سے دور ہو گیا ہے۔ اپنی اصل سے اسی دوری نے اس کے اندر ذوق پیدا کیا ہے، عشق پیدا کیا ہے، درد پیدا کیا ہے اور غریب الوطنی کا احساس پیدا کیا ہے۔ پھر اس غریب الوطنی کے احساس نے اس کے باطن میں اصل کی جانب واپسی و اپنے وطن —— حق یعنی خدا کی جانب واپسی کی خواہش پیدا کی ہے۔ گویا وہ ایک بہشت سے نکالا گیا اور زمین پر آیا ہے۔ اب یہ چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اسی بہشت کی جانب لوٹ جائے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا

آنا بے مقصد اور فضول نہیں بلکہ ایک کارِ خاص کیلئے بھیجا گیا ہے بہر حال یہی بس ہے اس جدائی نے اسے ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھا ہے۔

اس مکتب فکر کے مطابق انسان کا درد، خدا سے دوری کا درد، حق سے دوری کا درد اور حق کے قرب اور رب العالمین کی قربت کی جانب لوٹ جانے کی خواہش ہے۔ چنانچہ ہر انسان خواہ وہ کسی مقام، کسی کمال یا کسی نقطے تک بھی پہنچ جائے۔ پھر بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے معشوق تک نہیں پہنچا۔

کہا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ اس چیز کا طالب ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی اور جب تک وہ چیز اسے میسر نہ ہو اسے اس کی خواہش ہوتی ہے، لیکن جب وہ چیز اسے مل جائے تو اسے اس کی خواہش نہیں رہتی اور وہ اسے رد کر دے۔

ایک شخص کا کہنا ہے کہ میں ایک عجائب گھر میں نوادر دیکھنے میں مشغول تھا، وہاں میں نے ایک بہت ہی خوبصورت عورت کا مجسمہ دیکھا جو ایک تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نیز میں نے اس کی تخت پر ایک بے حد خوبصورت جوان مرد کا ایک مجسمہ بھی دیکھا لیکن اس حالت میں کہ اس کا ایک پاؤں تخت پر اور دوسرا پاؤں زمین پر تھا۔ اس نے اپنے مجسمے کی طرف سے اپنا منہ بھی پھیر رکھا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں سے بھاگ رہا ہو۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر میں نہ سمجھ سکا کہ سنگ تراش نے اس جوان مرد اور جوان عورت کے مجسمے حالت ملاقات کی بجائے حالت فرار میں کیوں تراشے ہیں؟ وہاں میں اس کے بارے میں کچھ جاننے کیلئے میں نے ان سے وضاحت چاہی کہ

مجسمے تراشنے میں مصروف رہا کیا مقصد تھا؟ انہوں نے بتایا کہ ان مجسموں کے ذریعے افلاطون کے مشہور نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان جس چیز کو چاہتا ہے شروع میں بڑے زبردست جذبے، شدید عشق اور بے تابی کے ساتھ اس کی جانب جاتا ہے لیکن جب وہ اسے پا لیتا ہے تو اس کا عشق دب جاتا ہے کیونکہ وصال عشق کا دشمن ہے۔ وصال کے بعد جب انسان کا دل بھر جاتا ہے تو پھر اسے نفرت و فرار کا احساس ہوتا ہے حالانکہ یہ ایک فطری بات ہے اور جن لوگوں نے اس مسئلے پر گہرا غور و فکر کیا ہے انہوں نے اسے حل کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں مسئلہ یہ ہے کہ انسان میں جو عشق موجود ہے جو کسی محدود اور فانی شے کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی ایسی چیز کا عاشق نہیں جو صرف زمان و مکان میں محدود ہو۔ وہ کمال مطلق کا عاشق ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کا عاشق نہیں — یعنی انسان ذات حق کا عاشق ہے، خدا کا عاشق ہے۔

جو شخص خدا کا منکر ہے وہ بھی خدا کا عاشق ہے حتیٰ کہ وہ منکر جو خدا کو ناسزا کہتے ہیں، اس کے بارے میں غلط گمان رکھتے ہیں اور مبدا کے قائل نہیں ہیں، وہ نہیں جانتے کہ وہ اپنی فطرت کی گہرائی میں کمال مطلق کے عاشق ہیں لیکن وہ اس کمال مطلق اور معشوق حقیقی کو گم کر بیٹھے ہیں۔

محی الدین عربی کا قول ہے: "مَا اَحَبَّ اَحَدٌ غَیْرَ خَالِقِہٖ"

کسی انسان نے اپنے خدا کے علاوہ کسی کو دوست نہیں رکھا اور دنیا میں اب تک ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے خدا کے علاوہ کسی اور کو دوست رکھا ہو لیکن خدائے تعالیٰ ان ظاہری ناموں کے پیچھے چھپ گیا اور مجنوں سمجھتا ہے کہ وہ لیلیٰ کا عاشق ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت اور وجدان

کی گہرائی سے بے خبر ہے۔

پیغمبر اس لیے نہیں آئے کہ وہ بندوں کو خدا کے نام سے آشنا کریں اور اس کی عبادت کرنا سکھائیں کیونکہ یہ چیز تو ہر انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے بلکہ اس لیے آئے ہیں کہ گمراہ انسانوں کو سیدھے راستے سے لگا دیں۔ اس لیے آپ کو مجنوں سے کہنا چاہیے کہ جناب آپ نے "کمال مطلق" کی پہچان میں غلطی کھائی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ لیلیٰ "کمال مطلق" ہے۔ اسی طرح آپ ایک وقت خیال کرتے ہیں کہ مقام و عہدہ کمال مطلق ہے اور ایک وقت آپ خیال کرتے ہیں کہ زندگی کمال مطلق ہے گویا آپ کمال مطلق کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔ درحقیقت آپ غلطی کھاتے ہیں اور انبیاء بشر کے رہنما اسی لیے آئے ہیں کہ وہ انہیں غلط فہمیوں سے نجات دلائیں۔

انسان کا درد اور انسان کا شوق وہ خدائی درد ہے۔ اگر وہ اسے پہچان جائے یعنی اگر غلط فہمیوں کے پردے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں اور اس کا معشوق اسے مل جائے تو وہ ویسی ہی عاشقانہ عبادت کرنے لگے — جیسی عبادتوں کی مثال ہم امام علی علیہ السلام میں دیکھتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کہتا ہے:

"جان لو کہ فقط اور فقط ایک چیز سے دلوں کو سکون حاصل ہو سکتا ہے — انسان اضطراب و بے چینی سے نجات حاصل کر سکتا ہے اور وہ ہے — اپنے خدا کے ساتھ راز و نیاز کرنا، اس کا ذکر کرنا۔"

ہاں قرآن مجید کہتا ہے کہ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ان مفروضوں نظریوں یا مثلاً دولت کے ساتھ کامیاب ہو سکتے ہیں اور تمام لوگوں کا مقصد ہو سکتا ہے ـــــ یوں ہو سکتا ہے کہ دل ہو سکتا ہے۔ یعنی انسان مال کی بدولت بے قراری، بے چینی اور مایوسی سے نجات پا کر آسائش حاصل کر سکتا ہے۔ تو یہ ان کی بھول ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ:

ان لوگوں کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔ ہم ان لوگوں کی بات پر غور کرنا چاہیے کہ اگر آپ یہ خیال کریں کہ یہی لوگ ہیں جو آپ کو آسائش اور اطمینان دلا سکتے ہیں اور انسان ان چیزوں کو حاصل کر کے محسوس کرتا ہے اس نے اپنا مطلوبہ کمال پا لیا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صرف خدا کو یاد کرنے سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ کئی ایک مکاتب فکر ایسے ہیں جو فقط اسی بات پر تکیہ کرتے ہیں۔ کچھ دوسرے مکاتب ہیں جو مخلوق خدا کا درد و احساس رکھنے پر زور دیتے ہیں اس بات پر کہ انسانوں کا درد رکھا جائے خدا کی خاطر حتیٰ کہ بعض لوگ کہتے ہیں جناب خدا کی خاطر انسانوں کا درد رکھنے کے کیا معنی ہیں؟

اگر انسان خدا کی طرف توجہ نہ کرے تو خلق خدا کیلئے اس کا جذبہ ہمدردی بھی بے نتیجہ رہے گا کیونکہ انسانیت کی حقیقت خدا تک پہنچنے کا درد ہے اور خدا تک پہنچنے کی خاطر انسانوں کا درد یعنی انسانوں کیلئے جذبہ ہمدردی مدد [illegible] انسان [illegible] کا تعین کرتے ہوئے [illegible] درست کہی

سے وہ کہتے ہیں:

کامل انسان کی سیر چار سفروں میں پوری ہوتی ہے:

(۱) انسان کا سفر ہے آپ سے خدا کی جانب اور جب وہ یہاں پہنچتا ہے تو

(۲) انسان کا سفر قرب خدا کے بعد خدا میں یعنی خدا کی پہچان کیلئے۔

(۳) انسان کا سفر خدا کے ساتھ ساتھ خلق خدا کی جانب

(۴) انسان کا سفر قرب خدا کے ساتھ خلق خدا کے درمیان خلق خدا کی نجات کی خاطر۔

اس ضمن میں اس سے بہتر بات نہیں کہی جا سکتی لیکن یہ باتیں اس وقت تک غلط ہیں جب تک انسان خدا سے جدا ہے کیونکہ وہ اس کی جانب سفر نہیں کر سکتا۔ تاہم جب وہ وہاں (خدا کے نزدیک) پہنچتا ہے تو خدا کو پہچان لیتا ہے۔ جب اسے قرب خدا حاصل ہوتا ہے تو وہ خدا کو اپنے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ خلق خدا کی جانب لوٹتا ہے اور اس کی نگاہوں میں خدا کا جلوہ ہوتا ہے۔ وہ ہر مرحلہ میں خدا کو پیش نظر رکھتا ہے۔ یہاں انسان ربانی انسان بن جاتا ہے اور وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو اپنے نفس کے لیے نہیں خدا کے خاطر کام کرتا ہے۔ جب ایسا انسان خلق خدا کے درمیان تحریک چلاتا ہے تو یہ تحریک خلق خدا کی نجات کیلئے، خلق خدا کو بیدار کرنے کیلئے اور خلق خدا کو خدا کے نزدیک لانے کیلئے ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ انسان کا سفر خلق سے خدا کی طرف ہے تو وہ یہیں کا یہیں رہ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان خود خدا کی جانب حرکت کیے بغیر دوسرے مکاتب کی طرح انسانوں کی نجات کی خاطر انسانوں کی طرف جانا چاہتا

ہے تو یہ بھی ایک خوش فہمی ہے ورنہ وہ کچھ نہیں کر پاتا کیونکہ انسان کو وہ لوگ نجات دلا سکتے ہیں جنہوں نے پہلے خود نجات حاصل کر لی ہو۔

انسان کو کس چیز سے نجات چاہیے؟

انسان کی نجات کے کیا معنی ہیں؟ کس چیز سے انسانوں کی نجات ہو؟ یہ انسانوں کی دوسرے انسانوں کی اسیری سے نجات ہے [illegible] حقیقی انسان کی [illegible] ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ جب انسان اپنے نفس کی اسارت سے اور اپنے محدود وجود سے نجات پائے۔ جب تک انسان اپنے محدود وجود سے نجات حاصل نہ کر لے وہ فطرت کی اسیری سے ہرگز رہا نہیں ہوتا اور دوسرے انسانوں کی اسیری سے بھی نجات نہیں پاتا۔

ابھی ہم پہلی منزل پر ہیں اور ہمیں چاہیے کہ اسے سیر و سلوک [illegible] رکھیں۔ بہرحال ماہ رمضان کی [illegible] کی [illegible] بات ہے۔ جب ماہ رمضان کی آخری دہائی [illegible] تو [illegible] تھے۔ آپ کا بستر مکمل طور پر [illegible] اور [illegible] ماہ رمضان کی آخری دہائی میں کسی رات نہیں سوتے تھے۔ [illegible] آخری دہائی کی راتیں — عبادت، خلوت اور مناجات کی رات ہے۔

اب میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ گزشتہ وقتوں کے [illegible] ہی ہے۔ یعنی بعض اوقات کچھ حد سے بڑھی ہوئی قدریں ہیں جو دوسری قدروں کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

چنانچہ گزشتہ زمانے میں اسلامی معاشرے نے عبادت کی قدر کی طرف

تمام میدان پر چھا گیا کہ وہ دوسری قدروں کو مٹا دینا چاہتا تھا میں محسوس کرتا ہوں کہ اب ایک اور قدر بھی [illegible] کی حالت میں ہے کیونکہ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اسلام کے اجتماعی میلانات کی جانب توجہ دیں اور اس کے خدائی میلانات کو فراموش کر دیں۔ گویا کہ وہ لوگ ایک دوسرے انحراف اور غلطی کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ فعل اس عرب کی مانند ہے جو ایک گدھے پر سوار ہونا چاہتا تھا۔ وہ بڑے زور و شور سے [illegible] اچھل کر دوسری طرف زمین پر جا گرا اور کہنے لگا:

"پہلے کی طرح ہو گیا" — یعنی میں زمین کا زمین پر رہ گیا۔

پس اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم اسلام کا معتدل راستہ چھوڑ دیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم معاشرے سے گریز کر کے [illegible] کی طرف مائل ہوں یا خدا سے گریز کر کے معاشرے کی طرف مائل ہوں، کیونکہ اسلام کی منطق کے مطابق ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ قرآن کو دیکھیں اور اس کے نکات کی جانب توجہ دیں — یہ شب بیداری اور عبادت کی شب ہے۔

آپ قرآن مجید کا ارشاد ملاحظہ کیجیے:

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت اور آپس میں بڑے رحمدل ہیں۔ تو انہیں دیکھے گا کہ خدا کے سامنے جھکے سجدے میں پڑے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔ کثرت سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف توریت

میں اور انجیل میں مذکور ہیں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے
پہلے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، وہ موٹی ہوئی اپنی
جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو
خوش کرنے لگی — تاکہ ان کی خوشی پر کافروں کا جی جلائے
جو لوگ ایمان لائے اور ان میں سے جنہوں نے اچھے کام کیے
خدا نے ان سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

اس آیت کی تفسیر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس میں فقط صحابہ ہی مقصود ہیں یا ان کے ساتھ تمام مسلمان کرام بھی مراد ہیں؟ یہ ایک ایسی بحث ہے جس کا ہمارے کسی دعوی پر کوئی غلط اثر نہیں پڑتا۔ ہاں تو رسول کریم کے صحابہ اور آپ سے تربیت یافتہ اشخاص کیسے ہیں؟ قرآن مجید اس بات کو بیان کرتا اور تشریح فرماتا ہے کہ وہ حق اور حقیقت کے دشمنوں کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار کی مانند ہیں جو کبھی شکست نہیں پاتی۔ یہاں قرآن 'کفار' کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی وہ شخص جو حقیقت کے چہرے کو چھپانا چاہتا ہے۔ پس ہمیں صریح حقیقت کے دشمنوں کے مقابلے میں مضبوط اور محکم ہونا چاہیے۔

آگے قرآن کہتا ہے:

خدا ان لوگوں سے الفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس
طرح پرا باندھ کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار
ہیں۔ (سورۂ صف۔ آیت ۴)

بلکہ معاشرے میں اور ان لوگوں کے درمیان جو اہل ایمان و حقیقت ہیں ان کی کیفیت کیا ہے؟ یہاں انسان کو محبت، مہربانی، یگانگت اور وحدت کا پیکر ہونا چاہیے۔ یہ ہے اسلامی معاشرے کی اجتماعی خصلت اور یہ وہی خصلت ہے جسے ہم نے صدیوں فراموش کیے رکھا ہے۔

اس کے بعد قرآن یہ کہتا ہے:

تو ان کو دیکھے گا کہ خدا کے سامنے جھکے سجدے میں پڑے ہیں،
خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں کثرت
سجود سے ان کی پیشانیوں پر گٹھے پڑے ہوئے ہیں۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

پھر قرآن اس عملی قدر کی جانب جاتا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو معاشرے کی جانب میلان کے نقطہ نگاہ سے بلند مقام رکھتے ہیں اور جو بیشتر خدا سے رزق اور روزی طلب کرتے ہیں۔ اب جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اسی پر قناعت نہیں کرتے اور دن بدن آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسے خدا کی رضا کے طالب ہیں اور یہ عبادت کی بلند ترین قسم ہے۔ وہ اپنی تمام عبادتوں کے نتیجے میں خدا کی رضا کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتے۔

کثرت سجود سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوئے ہیں،
ان کے یہی اوصاف توریت میں اور انجیل میں مذکور ہیں۔
وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے سوئی نکالی۔

(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید اسلامی معاشرے کے بارے میں ایک مثل

کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ پھلنے پھولنے والا معاشرہ ہے۔ یہ ایک ایسی کھیتی کا حکم رکھتا ہے جو تیزی سے بڑھنے لگتی ہے اور یوں زراعت سے کسب کسانوں کو حیران کر دیتی ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ ان باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح لایا گیا ہے۔ جبکہ قرآن اس امت کے فدائی پیروؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

؎ یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، خدا کے لیے سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم دینے والے، برے کام سے روکنے والے اور خدا کی حدوں کی نگہبانی کرنے والے ہیں اور ان مومنین کو خوشخبری دے دو۔

(سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۲)

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ توبہ کرنے والے، استغفار کرنے والے، عبادت کرنے والے اور روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے اور سجود کرنے والے ہیں ـــــ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے:

وہی جو اپنے معاشرے کی اصلاح کرنے والے ہیں اور اپنے معاشرے میں اچھائیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ ایک اور جگہ قرآن یہ کہتا ہے:

؎ وہ صبر کرنے والے، ثابت قدم رہنے والے[۱]، سچ بولنے

۱ قرآن میں لفظ صبر جہاں ثابت قدمی اور بالخصوص میدان جنگ میں ثابت قدمی کے معنوں میں آتا ہے۔

والے، خوش کردار، خیرات کرنے والے اور طلوع صبح استغفار کرنے والے ہیں۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۷)

اس آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: یعنی وہ ایسی جگہوں تک خلوت میں اور گریہ و بخشش کے لیے نماز سے پہلے خدا کے حضور گڑگڑاتے ہیں۔ عبادات اسلام میں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے جو شخص ان میں سے کسی ایک سے بے توجہی کرتا ہے، گویا وہ دوسرے سے بھی بے توجہی کرتا ہے۔

حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے اصحاب کے اوصاف میں ایک تعبیر ہے جو میں نے فقط ایک حدیث میں سنی ـــ مگر متعدد احادیث میں دیکھی ہے اور وہ یہ ہے:

؎۲ وہ رات کے وقت راہب اور دن کو شیر ہوتے ہیں۔ اگر آپ رات کو ان سے ملنے جائیں تو گویا آپ ایک راہب سے ملنے گئے اور اگر آپ دن میں ان سے ملنے جائیں تو وہ شیر معلوم ہوں گے۔ (سفینۃ البحار۔ مادہ صحب)

اب آپ رسول اکرمؐ کے اصحاب کو دیکھیں کہ وہ کس طرح اور کس حالت میں ہیں:

یہ مشہور حدیث اصول کافی میں ہے جسے شیعہ و سنی ـــــ دونوں ہی نے نقل کیا ہے اور مولوی معنوی نے بھی اس کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ یعنی ایک دن رسول اکرمؐ اصحاب صفہ کے پاس گئے اور اکثر اصحاب صفہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس دن آپ وہاں طلوع آفتاب سے پہلے پہنچے جبکہ اندھیرا چھٹ رہا تھا اور اجالا پھیل رہا تھا۔ وہیں اشارتاً آنحضرتؐ کی نگاہ ایک

ایک جوان پر اپنی حس کی حالت کچھ غیر معمولی سی تھی اور وہ اونگھ رہا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں دھنس گئی ہیں، رنگ زرد ہو گیا ہے اور وہ ایک عام شخص سے ہٹ کر غیر معمولی وضع رکھتا ہے۔ تب آپ نے فرمایا:

یعنی آنحضرتؐ نے پوچھا: تم نے صبح کیسے کی؟ اس نے جواب دیا: میں نے اس حالت میں صبح کی ہے کہ اہل یقین میں سے ہوں۔

یعنی جو بات آپ نے اپنی زبان کے ذریعے ہمارے کانوں میں ڈال دی ہے اسے اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

رسول کریمؐ نے اس جوان سے اس بارے میں مزید گفتگو کر کے دوبارہ ان سے بھی دریافت فرمایا:

یعنی ہر چیز کی علامت ہوتی ہے اور تم جو اہل یقین ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تمہارے یقین کی علامت کیا ہے؟ اس نے جواب کہا:

یعنی یا رسول اللہؐ میرے یقین کی علامت یہ ہے کہ وہ دن کو مجھے پیاسا رکھتا ہے اور رات کو جگائے رکھتا ہے۔

(اصول کافی جلد ۲۔ باب حقیقت ایمان و یقین)

یعنی میرے یقین کی علامت دن کو روزہ رکھنا اور رات کو عبادت کے لیے جاگتے رہنا ہے۔ میرا یقین مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں سر بستر پر رکھوں اور ایک دن بھی بغیر روزے کے رہوں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ چیزیں یقین کی ابتدائی علامتیں ہیں، اس سے آگے بھی کچھ بتاؤ۔ میں تمہارے اندر اس سے بڑھ کر بھی کوئی علامت چاہتا

ہوں۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! اس وقت جب کہ میں اس جگہ ہوں تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ میں اس دنیا کو دیکھ رہا ہوں اور وہاں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ چونکہ اس وقت جنت اور جہنم مخلوق اور موجود ہیں ـــــ میں اس وقت اہل جنت اور جہنمی کی آوازیں سن رہا ہوں۔ یا رسول اللہؐ! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ کے اصحاب میں سے ایک ایک کے بارے میں بتا دوں کہ ان میں سے کون کون جنتی اور کون کون جہنمی ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں خاموشی اختیار کرو۔

مولوی معنوی اپنی مثنوی میں کہتے ہیں

گفت پیغمبر صباحی زید را
کیف اصبحت ای رفیق باصفا
گفت عبداً مؤمناً باز اوش گفت
کو نشان از باغ ایمان گر شکفت
گفت تشنه بوده‌ام من روزها
شب نخفتم من ز عشق و سوزها
که بگویم یا فرو بندم نفس
لب گزیدش مصطفیٰ یعنی که بس

ایک صبح کو پیغمبر کریمؐ نے زید سے فرمایا کہ اے نیک دل ساتھی تو نے آج دن کا آغاز کیسے کیا؟

اس نے کہا کہ میری صبح ایک با یقین شخص کی سی ہے۔ آپ نے فرمایا: تیرے باغ ایمان و یقین کی تازگی کی علامت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں دن کو

دوسرے میں پیدا ہوتا ہوں، وہ رات کو محبت ہی میں جاگتا ہوں۔ اب فرمایئے کہ اپنا مشاہدہ بیان کر دوں یا چپ رہوں؟

حضور اکرم ﷺ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، یعنی دبا دیا کہ بس — خاموش!

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۹۶)

پھر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اے حارث۔ تمہاری خواہش کیا ہے؟ تم کیا آرزو رکھتے ہو؟

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! شہادت یعنی خدا کی راہ میں شہادت۔

یعنی اس کی عبادت اور یعنی اس کی آرزو — وہ یعنی اس کی راتیں اور یہ تھے اس کے دن اور اس کی آرزو یہاں — اسلام پر ایمان لانے والا ایسا ہوتا ہے اور اسلام کا۔۔ انسان۔ ایسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ شخص جو دونوں درد رکھتا ہے، لیکن یہ دوسرا درد اس پہلے درد سے بنتا ہے۔ یعنی وہ پہلا اس کا خدائی درد ہے جس نے اس میں یہ دوسرا درد پیدا کیا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے۔

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو نماز سے مدد چاہو اور صبر سے مدد حاصل کرو۔ بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۳)

وہ کونسی مدد ہے جو ہم نماز سے لے سکتے ہیں؟ وہ کونسی مدد ہے جو ہم خدا پرستی سے لے سکتے ہیں؟ وہ کونسی مدد ہے جو ہم خدا کی عبادت سے لے سکتے ہیں؟

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ معاشرے میں ایک حقیقی اور قوی مسلمان ہوں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایک طاقتور مجاہد ہوں تو آپ کو ایک خالص اور مخلص نمازی بننا چاہیے۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ نماز کی تحقیر کرتے اور کہتے ہیں: نماز پڑھنے کا کیا فائدہ ہے اور عبادت کیوں کی جائے؟ یہ تو بوڑھی عورتوں کا کام ہے اور انسان کو تو جتماعیت پسند ہونا چاہیے۔ ہاں ... یہ روشن خیال تو ہے لیکن یہ عمر بن خطاب جیسی روشن خیالی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ انہوں نے اذان میں سے — حَيَّ عَلَىٰ خَيْرِ الْعَمَلِ — کا جملہ نکال دیا تھا، کیوں؟ ایک قسم کی روشن خیالی ... لیکن ایک بڑی غلطی کے باعث! ان کے عہد حکومت میں اسلامی فتوحات اور اسلامی جہاد کا بڑا جوش تھا۔ مسلمانوں کے لشکر پر لشکر دشمن سے لڑنے کے لیے جاتے تھے۔ وہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی اپنے سے طاقتور دشمن کو شکست دیتے تھے۔ اس وقت کے مسلمان جو دو عظیم سلطنتوں سے لڑ رہے تھے ان کی تعداد بیس یا چالیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ جب کہ یہ سلطنتیں کئی لاکھ سپاہیوں کو لے کر جنگ کے لیے آتی تھیں لیکن مسلمان انہیں نیچا دکھا دیتے تھے۔ روم کئی لاکھ سپاہی لے کر ان سے لڑنے آیا — ایران بھی کئی لاکھ سپاہی لے کر ان سے لڑنے آیا، جب کہ یہ ایک لاکھ سے بھی کم ہوتے ہوئے دونوں محاذوں پر لڑ رہے تھے اور دشمنوں کو شکست دے رہے تھے۔ بہت خوب! اس طرح جہاد نے اپنی قدر و قیمت ثابت کر دی اور بتا دیا کہ جب اسلام مجاہدوں کی تربیت کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب عمر بن خطاب نے کہا کہ مصلحت اس میں ہے کہ ہم "حی علی خیر العمل" کو اذان سے نکال دیں۔ اذان میں مؤذن بلند آواز سے کہتا ہے "اللہ اکبر، اللہ اکبر" پھر وہ شہادتیں پڑھتا ہے — اس کے بعد کہتا ہے "حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ" یعنی نماز کی طرف آؤ، نماز کی طرف آؤ۔ وہ یہاں تک جو جملے ادا کرتا ہے ان میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر وہ کہتا ہے "حی علی الفلاح، حی علی الفلاح" یعنی نجات کی طرف آؤ، نجات کی طرف آؤ — کیونکہ نماز ذریعۂ نجات ہے۔ عمر بن خطاب نے کہا کہ یہاں تک بھی ہمارے لیے کوئی خرابی کی بات نہیں ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ "حی علی خیر العمل" یعنی بہترین عمل کی طرف آؤ، کیونکہ نماز بہترین عمل ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے تو یہ مجاہدین کے اعتمادِ نفس کو ٹھیس پہنچانے والی بات ہے۔ وہ سوچیں گے کہ اب ہم جا کر نماز پڑھیں یا جہاد کے لیے جائیں۔ چونکہ نماز بہترین عمل ہے اس لیے کیوں نہ ہم میدانِ جنگ میں جانے کی بجائے مدینے ہی میں رہیں اور مسجد نبوی میں رسول اکرمؐ کے مقبرے کے قرب میں نماز پڑھیں کہ جو بہترین اعمال میں سے ہے۔ اگر کچھ دوسرے لوگ جنگ پر جاتے ہیں تو جائیں — ان کو زخم لگیں اور ان کی آنکھیں پھوڑی جائیں — ان کے ہاتھ کاٹے جائیں اور ان کے پیٹ پھاڑے جائیں — وہ جا کر دشمن کو قتل کریں اور ہوتے رہیں — ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آرام سے اپنے گھروں میں رہیں گے اور چار رکعت نماز پڑھیں گے پھر بھی ان سے اچھے رہیں گے!

اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے کے خدشے کے پیشِ نظر عمر بن خطاب

نے کہا — نہیں! ہمیں "حی علی خیر العمل" کی بجائے "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہنا چاہیے۔ یعنی نماز نیند سے بہتر اور اچھی چیز ہے۔ چونکہ اذان میں کہا جانے والا "حی علی خیر العمل" کا جملہ ایک مجاہد کے اعتمادِ نفس اور جوشِ جہاد کو کمزور کرتا ہے، لہٰذا ہم اس کی جگہ پر "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہیں گے۔

تاہم عمر بن خطاب نے یہ نہیں سوچا کہ پچاس ساٹھ ہزار سپاہی جن کی تعداد قطعاً ایک لاکھ تک نہیں پہنچتی وہ دشمن کی کئی لاکھ فرد پر مشتمل فوج کے خلاف دو مختلف محاذوں پر کس طاقت سے لڑ رہے ہیں اور فتح پا رہے ہیں؟ اس فتح کا کیا راز ہے؟

کیا یہ فتح ہتھیاروں کے بل بوتے پر ہے؟ کیا عربوں کے ہتھیار ایرانیوں اور رومیوں کے ہتھیاروں سے بہتر اور کارگر تھے؟ قطعاً نہیں! ایران اور روم اس زمانے کی دو ترقی یافتہ مملکتیں تھیں اور ان کے سپاہیوں کے پاس بہترین ہتھیار رہتے تھے۔ چنانچہ جو تلواریں ایران اور روم کے فوجیوں کے پاس تھیں ان کے مقابلے میں عربوں کے ہتھیار ٹوٹے ہوئے لوہے کے مانند تھے۔

کیا عربوں کی نسل رومیوں اور ایرانیوں کی نسلوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ زور آور تھی؟ ہرگز نہیں!

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شاپور ذوالاکتاف نے ایران سے جا کر عربوں پر کیا قیامت ڈھائی۔ کیا اس نے ہزاروں عربوں کو قیدی نہیں بنایا؟ کیا اس نے سوراخ کر کے ان کے کندھے سیدھے نہیں کیے؟ کیا اس نے انہیں زنجیریں نہیں پہنائیں اور ان کے بازو زنجیروں میں نہیں جکڑے؟ اس وقت عربوں کا دور

کہاں تھی؟ اس کے بعد بھی کیا ایرانیوں نے عربوں کو شکست نہیں دی؟ پھر عربوں نے کس بل بوتے پر جنگ لڑی اور ایران و روم کی فوجوں کو شکست دی؟ یہ فتح انہوں نے قوت ایمان کی بدولت حاصل کی۔ ایمان کی یہ قوت وہی قوت ہے جو انہوں نے "حی علی خیر العمل" سے حاصل کی۔ یعنی یہ وہ طاقت ہے جو انہوں نے نماز سے حاصل کی اور یہ وہ طاقت ہے جو انہوں نے اپنے خدا سے راز و نیاز کر کے حاصل کی۔ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق جب انسان رات کو خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے، راز و نیاز کرتا ہے اور اس کے حضور گڑگڑاتا ہے تو وہ اپنے خدا سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو اسے اعتماد نفس عطا کرتی ہے۔ یعنی یہ وہ اعتماد نفس ہے جو ایران کو شکست دیتا ہے اور یہی عرب کا وہ اعتماد نفس ہے جو روم کو شکست دیتا ہے۔ عرب نے یہ اعتماد نفس کہاں سے حاصل کیا؟ ہاں یہ اعتماد نفس اس نے ایمان سے حاصل کیا ہے۔ نماز کیا ہے؟ یہ اس ایمان کو تازہ کرنے اور زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے جو اس نے "اللہ اکبر" سے حاصل کیا ہے۔ وہ نماز میں کئی مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے۔ یعنی خدا بزرگ و برتر ہے۔ خدا بزرگ و برتر ہے ہر چیز اس کے سامنے ہیچ ہے۔ پھر وہ خدا کی ظاہری عظمت اور جاہ و جلال کو دیکھتا ہے تو ایک بار پھر "اللہ اکبر" کہتا ہے جو ان سب بڑائیوں کا اقرار ہوتا ہے یعنی اس کے مقابل یہ سب چیزیں ہیچ ہیں۔ اس کے بعد جب کبھی وہ اپنے مقابلے پر کئی لاکھ سپاہیوں کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔

لا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قدرت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ خدا پر تکیہ رکھو ___ خدا پر بھروسہ کرو ___ خدا سے طاقت حاصل کرو ___ اور اسی سے مدد مانگو وہی سب سے بڑا ہے۔

ایک مسلم مجاہد کو یہی نماز ایسی طاقت عطا کرتی ہے۔ جبکہ عمر بن خطاب کہتے ہیں کہ "حی علی خیر العمل" کا جملہ اس بات کا موجب بنتا ہے کہ ایک مسلمان مجاہد جہاد سے کنارہ کش ہو جائے، گھر میں آرام کرے اور نماز پڑھتا رہے۔ لیکن ان کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جس شخص پر جہاد واجب ہو اور اس کا محاذ جنگ پر جانا لازم ہو، اس کا نماز کے لیے مسجد مدینہ میں رہ جانا حرام ہے۔ کیونکہ نماز کے قبول ہونے کی شرط جہاد ہے اور جہاد کے قبول ہونے کی شرط نماز ہے۔ جو شخص ایک مجاہد ہونے کی شرط پوری کرتا ہو اس پر واجب ہے کہ جہاد کرے، ایسے جہاد کے وقت اس کی نماز باطل ہے اور درحقیقت یہ کہ ایسی نماز خیر العمل نہیں۔ بلکہ یہ شر العمل ہے۔ یہ وہ نماز نہیں جو اسلام نے سکھائی ہے۔ اس لیے سعد کی نماز یاد دلاؤ۔ وہ نماز جو جہاد سے فرار کا ذریعہ بنے اور انسان کو کھینچ کر مسجد کے گوشے میں لے جائے وہ اسلام کی نماز نہیں ہے، اسلام کی نماز خیر العمل ہے۔ یہ نہ کہو کہ تم اذان سے "حی علی خیر العمل" کا جملہ نکال دیں کیونکہ یہ جہاد کی بجائے نماز پڑھتے رہنے کا سبق دیتا ہے۔

اے وہ شخص جو یہ نہیں کہہ رہا ہے تو اس غلط فہمی کو اپنے دل سے نکال دے اور جان لے کہ اسلام کی منطق اور اسلامی قدروں کے نظام میں سب سے بڑی قدر عبادت ہے، لیکن وہ صحیح اسلامی عبادت ہونی چاہیے۔

یعنی وہ ان تمام صفات کے ساتھ موجود ہو جو قرآن کے معیار کے مطابق ہوں۔ قرآن نے ہمیں معیار دیا اور فرمایا:

بے شک نماز انسان کو بے حیائی اور برے کاموں
سے روکتی ہے۔ (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۴۵)

گویا یہ نتیجہ نماز کی خصوصیت ہے کہ وہ انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے۔ اب اگر آپ دیکھیں کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ برے کام بھی سرانجام دے رہے ہیں تو جان لیں کہ آپ کی نماز ——— نماز نہیں ہے۔ بہتر ہے آپ اپنی نماز درست کیجیے۔ نماز آپ کو اعلیٰ انسانی قدروں تک پہنچاتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کی نماز حقیقی نماز ہو۔

ہمیں تمام اصول اور تمام سبق امام علی علیہ السلام سے سیکھنے چاہئیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ ——— علیؑ تمام اسلامی قدروں کا مجموعہ ہیں۔ نہج البلاغہ جو ان کا کلام ہے، وہ ایک ایسا کارنامہ ہے کہ آپ جس مقام کو بھی دیکھیں وہاں ایک نئی منطق ملاحظہ کریں گے اور ایک مختلف شخصیت کو دیکھتے ہوئے پائیں گے۔

امام علی علیہ السلام ہر جگہ ایک الگ شخصیت رکھتے ہیں یعنی وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس میں تمام انسانی قدریں یکجا ہو گئی ہیں۔

ایک جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ کی منطق رزمیہ ہے اور آپ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے ساری زندگی میدان میں کام کیا ہے۔ ان میں ایک ایسی روح ہے جو جنگ و جدل سے پُر ہے۔ ایک اور مقام پر ہم ان کو ایک عارف پاتے ہیں کہ انہیں عاشقانہ راز و نیاز کے علاوہ کچھ سروکار نہیں۔

آج اکیسویں رمضان کی رات ہے لہٰذا میں نہج البلاغہ سے دو مختصر سی عبارتیں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔ اگرچہ نہج البلاغہ میں اس موضوع پر اور بھی بہت سی باتیں موجود ہیں لیکن وقت کم ہے۔ تاہم میں یہ عبارتیں آپ حضرات کو منطق سے واقفیت دلانے کی خاطر نقل کر رہا ہوں:

صفین میں امیر المومنینؑ کی معاویہ سے پہلی مرتبہ مڈھ بھیڑ ہو رہی ہے۔ معاویہ کے لشکری اس طرف سے آتے ہیں اور آپ کے لشکری اس طرف سے جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک مقام پر جو دریائے فرات کے کنارے واقع تھا ——— ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ معاویہ اپنے ساتھیوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ جتنی جلدی کر سکیں اور اس سے پیشتر کہ علیؑ اور ان کے ساتھی وہاں پہنچیں پانی پر بند کر دیں۔ وہ لوگ گھاٹ پر قابض ہو کر خوش ہوتے اور کہتے ہیں ایک وسیلہ پر تو ہم نے قبضہ کر لیا ہے۔ جب علی اور ان کے لشکری پہنچیں گے اور انہیں پانی نہیں ملے گا تو وہ مجبوراً یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں گے پھر اور بھی بہترین وسیلے ہمارے ہاتھ آ جائیں گے۔

تب امام علیؑ نے اپنے لشکریوں سے فرمایا کہ ہمیں پہلے ان لوگوں سے بات چیت کرنی چاہیے۔ شاید اس طرح ہم اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں کیونکہ جو کام باتوں سے مکمل ہو سکتا ہو اسے طاقت سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو تم کوئی ایسا کام نہ کرو کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ اور خونریزی شروع ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے معاویہ کو پیغام بھیجا:

ابھی ہم اس مقام پر پہنچے بھی نہیں اور تم نے پانی بند کر دیا!

معاویہ نے جنگی مشاورتی کونسل تشکیل دی اور اپنے مشیروں سے رائے

طلب کی کہ تم کیا مناسب سمجھتے ہو ہم ان کے لیے پانی کھول دیں یا نہیں؟ ان جنگی مشیروں میں سے بعض نے کہا پانی کھول دیجیے اور بعض نے کہا نہ کھولیے۔ چنانچہ عمرو عاص نے کہا علیؑ کے لیے پانی کھول دیجیے ورنہ وہ بزور حاصل کریں گے اور آپ کی بے عزتی ہوگی۔ دوسروں نے کہا: نہیں ہم نہیں کھولیں گے اور وہ ہم سے لے بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ پانی نہ کھولا گیا اور یوں امیر المومنینؑ پر جنگ مسلط کر دی گئی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس وقت علیؑ کھڑے ہوئے اور اپنے لشکر کے سامنے ایک رزمیہ تقریر کرنے لگے۔ اس تقریر کا اثر ہزار ڈھولوں ہزار باجوں ہزار نغموں اور ہزار فوجی مارچوں سے زیادہ تھا۔

آپ نے باآواز بلند فرمایا:

اے لوگو! معاویہ نے گمراہوں کے ایک ٹولے کو اپنے گرد جمع کر لیا ہے اور انہوں نے تم پر پانی بند کر دیا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے تم پر پانی بند کر دیا ہے۔ لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟ تمہیں دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا چاہیے۔

"وہ تم سے جنگ کے بھوکے طلب گار ہیں تو اب یا تو تم ذلت اور اپنے مقام کی پستی اور حقارت پر سر تسلیم خم کر دو یا اپنی تلواروں کی پیاس خون سے بجھا کر اپنی پیاس پانی سے بجھاؤ۔" (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۵۱)

میرے ساتھیو کیا تم پیاسے ہو؟ کیا تم میرے پاس اس لیے آئے ہو کہ تمہارے پاس پانی نہیں اور تم پیاسے ہو اور پانی چاہتے ہو؟ تمہیں چاہیے کہ

اپنی تلواریں ان پلیدوں کے خون سے سیراب کرو تاکہ پھر خود تم پانی سے سیراب ہو جاؤ۔

بعد میں آپ نے ایک جملہ فرمایا جس کے سبب میں جوش و خروش پیدا کر دیا۔ امام علیؑ نے رزمیہ اور عسکری نگاہ سے موت اور زندگی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! زندگی کے کیا معنی ہیں اور موت سے کیا مراد ہے؟ کیا زندگی کے معنی زمین پر چلنے، کھانے پینے اور سونے کے ہیں؟ کیا موت سے مراد زمین میں دفن ہو جانا ہے؟ نہیں ——

دشمنوں سے دب جانا جیتے جی موت ہے اور غالب ہو کر مرنا —— جینے کے برابر ہے (حوالہ سابق)

نہ یہ زندگی ہے اور نہ وہ موت ہے۔ زندگی یہ ہے کہ زندہ رہو تو فتح مند رہو اور مرنا یہ ہے کہ زندہ رہو لیکن دوسرے کے محکوم اور مغلوب ہو کر جیو

ملاحظہ فرمائیے یہ جملہ کس قدر رزمیہ ہے اور کتنا مؤثر ہے

اس جملے نے سو فوجی مارچوں سے زیادہ اثر کیا۔ اب جتنی جلد ہو سکے امام علیؑ کے لشکر کی اگلی طرف پر نظر رکھنی چاہیے۔ دیکھیے کہ آپ کے لشکر نے معاویہ کے لشکر کو کئی کلومیٹر دور تک دوسری جانب دھکیل دیا اور گھاٹ ان کے قبضے میں آ گیا ہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر پانی روک لیا اور معاویہ پانی سے محروم ہو کر رہ گیا۔ تب اس نے ایک خط بھیجا جس میں پانی کھول دینے کی درخواست کی گئی تھی۔ علیؑ کے اصحاب نے کہا: یہ ناممکن ہے کہ ہم ان کے لیے پانی کھول دیں کیونکہ اس کی پہل خود معاویہ نے کی اور کہا کہ ہم تمہیں پانی نہیں لینے دیں گے

لیکن امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا:

ہم ایسا کام ہرگز نہیں کریں گے کیونکہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے۔ میں میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتا ہوں لیکن ایسی چند حرکتوں کے ذریعے ہرگز فتح نہیں چاہتا۔ ایسی غیر انسانی باتوں کے ذریعے فتح پانا میرے شایانِ شان نہیں ہے اور نہ ایک معزز اور محترم مسلمان کے شایانِ شان ہے۔

اسے کہتے ہیں مروت اور مردانگی لیکن مروت ـــــ شجاعت سے بلند تر ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی نے امام علی علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ شعر کہا ہے تو آپ کے بارے میں ان کے بہترین اشعار میں سے ہے:

در شجاعت شیر ربانیستی
در مروت خود کہ داند کیستی

شجاعت میں آپ خدا کے شیر ہیں اور مروت میں کوئی آپ کی تعریف نہیں کر سکتا کہ آپ کیا ہیں۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۹۰)

یہاں ہم امام علیؑ کو ایک دوسرے پہلو سے اور ایک حیثیت میں دیکھتے ہیں۔

آئیے ایک مرتبہ پھر امام علی علیہ السلام کی زندگی پر نگاہ ڈالیں جب آپ لوگوں کے کاموں سے فارغ ہو جاتے تو پھر آپ ہوتے اور آپ کا خدا، آپ ہوتے اور آپ کی خلوت، آپ ہوتے اور آپ کے مناجات اور عبادت اور دعا و نیاز۔

خوش قسمتی سے یہ بھی نہج البلاغہ میں ہے کہ:

خدایا! تو اپنے دوستوں کے ساتھ تمام انس رکھنے والوں سے زیادہ مانوس ہے اور جو تجھ پر بھروسہ رکھنے والے ہیں ان کی حاجت روائی کے لیے ہر وقت پیش پیش ہے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۲۳)

یہاں ہم بالخصوص ان جملوں سے کہتے ہیں کہ دوستانِ خدا کی جانب زیادہ توجہ دیں تاکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں کو سمجھ سکیں۔

ہاں تو امیرالمومنینؑ فرما رہے ہیں کہ اے خدا! تو اپنے دوستوں کے لیے سب سے بڑا انیس ہے یعنی اے خدا! جو لوگ تیرے ساتھ دل لگا رکھتے ہوں وہ تیرے سوا کسی اور کے ساتھ نہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں تیرے سوا میں کسی انیس (ساتھی) کے ساتھ نہیں ہوں۔ [illegible] جب تیرے ساتھ ہوں تو محسوس کرتا ہوں کس کے ساتھ ہوں [illegible] جو لوگ تجھ پر بھروسہ رکھتے ہیں تو ان کے لیے ہر دوسرے شخص سے زیادہ حاضر اور زیادہ آمادہ ہے۔

۱۱۔ اے خدا تو ان کی باطنی کیفیتوں کو دیکھتا ہے اور ان کے چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے۔ (خطبہ سابق)

یعنی اے خدا! تو اپنے دوستوں اور اپنے عاشقوں کے باطن اور ضمیر کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان کے ضمیر اور باطن سے آگاہ ہے۔ تو ان کے عرفان اور بصیرت کی حدود سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ بصیرت کے کس مقام پر ہیں۔ ان کے راز تیرے سامنے ظاہر ہیں اور ان کے دل تیری جانب پرواز کر رہے ہیں۔

دعائے کمیل کو پڑھنے کی کوشش کیجیے ـــــ یہ امام علیؑ کی دعا ہے اور
پیشہ ور مہیں کے لحاظ سے عرفان کی بلندیاں اس دعا میں نظر آتی ہیں
یعنی اگر آپ یہ دعا شروع سے آخر تک پڑھیں تو آپ نہیں پائیں
گے نہ آخرت، اور آخرت سے میری مراد بہشت اور جہنم ہے۔ اس دعا میں آپ
کیا دیکھیں گے؟ وہ جو دنیا سے بلند اور آخرت سے بھی بلند ہے۔ یعنی خدا
کی حمد ... میں ایک عاشق عبادت گزار اور دل دادہ شیدا بندے کے عاشق
کی ذات قدس کے ساتھ روابط ـــــ یعنی عبادت کی حقیقت آپ دیکھیں
گے کہ امام علی علیہ السلام خدا سے کیسے راز و نیاز کر رہے ہیں کیسے مناجات
کر رہے ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے ماہ رمضان کی دعا ہائے سحر میں
جو ابو حمزہ ثمالی سے منسوب دعا میں اپنے خدا سے کیسے راز و نیاز اور مناجات
کی ہے؟ یہ ہی درست مسلمان ہونے کا پہلا قدم ہے۔ یعنی پہلا قدم یہ ہے
کہ ہم اپنے خدا کے نزدیک ہوں اور اس کے نزدیک ہونے سے ہم خدا کی اور
اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس یکطرفہ
عبادت کو ترک کریں کیونکہ اسلام ہمیشہ اس علت کے یکطرفہ عبادات
کی مصیبت سے دوچار رہا ہے۔ پھر اس لیے کہ ہم ایک دور تسلسل میں دوبارہ یکطرفہ
عبادات کی اس بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں ـــــ ہمیں عبادت کی اہمیت
کو ہرگز کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

امام صادق علیہ السلام نے اپنے آخری وقت میں جب یہ حکم دیا کہ میرے
تمام رشتہ داروں کو جمع کرو تو وہ جمع ہو گئے۔ تب امام علیہ السلام نے اپنی

مبارک آنکھیں آخری مرتبہ کھولیں، ایک جملہ کہا اور پھر رحلت فرما گئے
وہ جملہ یہ تھا

"یعنی جو شخص نماز کو بے قدر سمجھے اسے ہماری شفاعت
نصیب نہ ہوگی!"

امام علی علیہ السلام کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دور آپ کی
زندگی کی آخری دو ساعتیں ہیں۔ آپ کی زندگی کا پہلا دور آپ کی پیدائش
سے رسول اکرمؐ کی بعثت تک ہے۔ دوسرا دور رسول اکرمؐ کی بعثت سے
ہجرت تک ہے۔ تیسرا دور ہجرت سے رسول اکرمؐ کی وفات تک ہے اور اس
کا رنگ ایک ہے۔ چوتھا دور رسول اکرمؐ کے وصال سے خود آپ کی خلافت
تک ۲۵ سال کا ... پانچواں دور آپ کا ساڑھے
چار سال کا دور خلافت ہے۔ آپ کی زندگی کا چھٹا دور ضربت سے شہادت تک
ہے جو دو دن رات سے کم ہے لیکن یہ امام علی علیہ السلام کی زندگی کا سب
سے حیرت انگیز دور ہے۔

اس وقت جب امام علی علیہ السلام موت سے قریب ہو گئے ان لمحات
میں آپ کا کامل انسان ہونا زیادہ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ کامل انسان کے معیار
میں سے ایک یہ ہے کہ وہ موت کا سامنا کیسے کرتا ہے۔ موت کا سامنا
کرتے وقت آپ کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ جب آپ کے سر مبارک پر ضرب لگی
تو آپ سے دو جملے سنے گئے:

پہلا یہ تھا کہ آپ نے فرمایا:

"قسم ہے رب کعبہ کی کہ میں کامیاب ہو اور شہادت

حاصل کی جو میرے لیے کامیابی ہے۔

دوسرا جملہ یہ تھا:

اس آدمی کو پکڑ لو!

امام علی علیہ السلام کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ ایک طبیب جس کا نام اثیر بن عمرو تھا، جس نے عرب اور جندی شاپور میں طب کی تعلیم پائی تھی اور کوفہ میں رہتا تھا۔ اس کو امیر المومنینؑ کے زخم کا معائنہ کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اس نے اسی وقت مناسب وسائل سے اچھی طرح معائنہ کیا اور سمجھ گیا کہ زہر امامؑ کے خون میں سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے ناامیدی ظاہر کی اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! اگر آپ نے کوئی وصیت کرنی ہو تو کر دیں.....

جب بی بی ام کلثوم اس زخمی اور قیدی شخص (ابن ملجم) کے پاس سے گزریں تو انہوں نے اسے سخت سست کہتے ہوئے فرمایا:

اے ملعون! میرے باپ نے تیرے ساتھ کون سا برا سلوک کیا تھا کہ تو نے یہ کام کیا؟

پھر کہنے لگیں:

مجھے امید ہے کہ میرے والد صحت یاب ہو جائیں گے اور تیرے لیے صرف رسوائی ہی رہ جائے گی۔

جب بی بی کلثوم نے یہ جملہ ادا کیا تو اس نے کہا:

آپ خاطر جمع رکھیں ـــــ میں نے یہ تلوار ہزار درہم یا دینار سے خریدی ہے اور ہزار ہی اس کو زہر آلود کرانے کے لیے دیے ہیں۔ اس

نے اس پر ایسا زہر لگوایا ہے کہ اگر یہ فقط آپ کے والد کے سر پر نہیں بلکہ ایک وقت تمام اہل کوفہ کے سروں پر لگتی تو وہ سب ہلاک ہو جاتے۔ پس آپ ابھی سے سمجھ لیں کہ آپ کے والد زندہ نہیں رہیں گے۔

لیکن امام علیؑ کے جسم پر انسانی معجزے یہاں ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ کے لیے غذا لائی گئی مگر آپ غذا نہیں کھا سکتے تھے۔ تب آپ کے لیے دودھ لایا گیا جو آپ نے تھوڑا سا پی لیا۔

پھر اپنی وصیتوں کے ضمن میں فرمایا: اپنے اس قیدی (ابن ملجم) کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اے بنی عبد المطلب! ایسا نہ ہو کہ میری وفات کے بعد لوگوں سے کہتے پھرو کہ امیر المومنینؑ مار دیے گئے ـــ فلاں شخص اس کا محرک تھا اور اس طرح مختلف آدمیوں پر تہمت لگانے لگو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ایسی باتیں کرو ـــــ میرا قاتل یہی شخص ہے!

آپ نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا:

میرے بیٹے حسن! اس (ابن ملجم) نے تمہارے باپ کو ایک سے زیادہ ضرب نہیں لگائی ہے۔ اس نے دو ضربیں نہیں لگائیں۔ میرے بعد تمہیں خود اختیار ہے کہ اگر تم اسے آزاد کرنا چاہو تو آزاد کردو اور اگر قصاص لینا چاہو تو یاد رکھو کہ اس نے تمہارے باپ کو ایک ضرب لگائی ہے ـــ تم بھی اسے فقط ایک ضرب لگانا۔ وہ اس ضرب سے مارا جائے ورنہ مر جائے تو خیر!

۱۔ شرح نہج البلاغہ صبحی صالح صفحہ ۴۲۲

پھر آپ نے اپنے اس قاتل کے بارے میں بھی پوچھ لیا کہ آیا اُسے کھانا پانی دیا گیا ہے یا نہیں؟ اپنے دشمن سے بھی آپ کا سلوک ایسا تھا مولوی معنوی نے کہا ہے:

در شجاعت شیرِ ربانیستی
در مروت خود کہ داند کیستی

بہادری میں تو آپ کا لقب شیرِ خدا ہے۔ مروت میں کوئی آپ کی تعریف نہیں کر سکتا۔ (مثنوی مولانا روم صفحہ ۹۷)

یہ امام علی علیہ السلام کی مردانگی اور انسانیت کا نمونہ ہے۔ آپ بستر میں بیٹھے ہیں اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے آپ کی حالت خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ زہر آپ کے مقدس بدن پر اور زیادہ اثر کر رہا ہے۔ اصحاب آتے ہیں ___ وہ پریشان ہیں ___ وہ روتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ علیؑ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور شگفتگی ہے۔

آپ فرما رہے ہیں:

"خدا کی قسم، موت کا ناگہانی حادثہ ایسا نہیں ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ اور نہ ایسا سانحہ ہے کہ میں اسے برا جانتا ہوں۔ میری مثال بس اس شخص کی سی ہے جو رات بھر پانی کی تلاش میں رہے اور صبح ہوتے ہی چشمہ تک پہنچ جائے اور اس ڈھونڈنے والے کی مانند ہوں جو مقصد کو پالے اور جو خدا کے یہاں ہے وہی نیک کاروں کے لیے بہتر ہے۔" (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین وصیت ۲۳)

یعنی جو کچھ مجھ پر گزری ہے وہ ایسی چیز نہیں جو مجھے ناپسند ہو۔ ہرگز نہیں ___ یہ موت اور شہادت ہے۔ خدا کی راہ میں موت اور شہادت ایک ایسی چیز ہے جس کی مجھے ہمیشہ آرزو رہی ہے۔ اس سے بہتر ہوگا کہ میں عین عبادت کی حالت میں شہید ہو جاؤں۔ اس کے بعد آپ نے وہ مثال بیان کی جس سے عرب بخوبی آشنا رہے ہیں۔ وہ عرب جو بیابانوں میں رہتے اور پر مشقت زندگی بسر کرتے تھے ان کو جہاں کہیں پانی اور سبزہ نظر آتا وہاں ڈیرہ ڈال دیتے اور جب وہ ختم ہو جاتا تو دوسری جگہ جا بستے تھے چونکہ دن گرم ہوتے تھے اس لیے راتوں کو ایسی جگہ تلاش کرتے جاتے تھے کہ جہاں پانی ہو۔

امام علیؑ فرماتے ہیں:

اے لوگو! اس شخص کو کتنی خوشی ہوتی ہے جو اندھیری رات میں پانی تلاش کر رہا ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے

اس کلام میں آپ اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں: میری مثال اس عاشق کی ہے جو اپنے معشوق تک پہنچ گیا ہو۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں پانی تلاش کر رہا ہو اور اچانک اسے پانی مل جائے۔

اس ذیل میں حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے:

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
واندر آں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی
آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند

پچھلے صفحات میں حافظ شیرازی نے امام علیؑ کے اس ارشاد کی تشریح کی ہے کہ "رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا" یعنی کل رات مجھے غم دل کی نے نجات دلائی جو عبادت کے اندر جیسے ہی مجھے شہادت کا سبب مل پیدا ہو گیا۔ وہ کیسی اچھی رات اور کیسی پیاری صبح تھی کہ جس میں مجھے میرا نصیب (مرتبہ شہادت) دیدیا گیا۔

امام علیؑ کی سب سے زیادہ پرسوز وہ باتیں ہیں جو آپ نے اپنی تقریباً دو آخری ساعتوں میں کہیں۔

امام علیؑ سے ۱۹ رمضان کو صبح کے وقت سے تھوڑی دیر بعد زہر بھری تلوار کی ضرب لگائی اور گھنٹوں کو دو جی رات کے وقت آپ کی مقدس روح عالم بالا کی جانب پرواز کر گئی۔ ان آخری ساعات میں بھی اہل وعیال آپ کے سر کے گرد جمع تھے۔ آپ کے مبارک بدن پر زہر کا بہت زیادہ اثر ہو گیا تھا۔ بعض اوقات آپ پر غشی طاری ہو جاتی ——— لیکن جو نہی آپ کو ہوش آتا آپ اپنی زبان سے دعا یا اقوال بکھیرنے لگتے تھے۔ اس وقت آپ حکمت کی باتیں بتاتے نصیحتیں کرتے اور وعظ فرماتے تھے۔ ان آخری باتوں میں بھی جوش و روح خطابت پایا جاتا ہے جیسے آپ نے بیس عنوانوں میں بیان کیا ہے

چنانچہ آپ اہل بیتؑ کو آواز دیتے ہیں، اور سب سے پہلے حسنؑ و حسینؑ کو مخاطب فرماتے ہیں:

میرے حسنؑ! میرے حسینؑ! میرے تمام فرزندو اور دوسرے تمام لوگو
جن تک روز قیامت تک میری باتیں پہنچیں ——— میں
تمہارے ساتھ ہوں (یعنی ہم اور آپ جو یہاں بیٹھے ہیں

ہم بھی امام علی علیہ السلام کے مخاطب ہیں)۔

۲۵ پھر ہمارے مولا سلام کی جامعیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

آپ خدا کا خوف دلا کر ایک ایک چیز کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی نماز کے بارے میں خدا کا خوف کرو کہ اس کا حکم یوں ہے ——— زکوٰۃ کے بارے میں خدا کا خوف کرو کہ اس کا حکم یوں ہے ——— خدا کا خوف کرو کہ ...... اور ...... آپ کہتے چلے گئے اور وہ بیس عنوان جو آپ کی نظر میں تھے وہ سب کے سب بیان کیے۔ (تحف العقول صفحہ ۳۵)

جن لوگوں کی نگاہیں علیؑ کے ہونٹوں پر جمی ہوئی تھیں انہوں نے اچانک دیکھا کہ مولا علیؑ کی حالت بہت تبدیل ہو گئی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ کی مبارک پیشانی پر پسینہ آ گیا ہے اور آپ نے اپنی توجہ لوگوں کی جانب سے ہٹا لی ہے اور اپنی دنیا میں چلے گئے ہیں۔ آنکھیں اور کان آپ کے ہونٹوں پر لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں۔ اتنے میں میرے مولاؑ کی آواز بلند ہوئی:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

پانچویں نشست

کمال اور اخلاق کا رابطہ

"وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

(سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

ہر صاحب مکتب شخص جو نوع انسان کے لیے کوئی ضابطہ حیات لاتا ہے وہ انسان کے کمال یا کامل انسان کے بارے میں ایک نظریہ رکھتا ہے۔ وہ چیز جس کو اخلاق کا نام دیا جاتا ہے اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ایک علم نہیں، "فن" ہے۔ یعنی اخلاق کا تعلق اس سے ہے جو "ہونا چاہیے" اور اس سے نہیں جو موجود ہے۔

اخلاق سے مراد وہ اچھی صفات ہیں جو انسان میں ہونی

چاہییں اور بہتر یہی ہے کہ وہ یہ صفتیں رکھتا ہو۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہو تو وہ انسانیت کے بلند مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے اور یہی ایک بلند انسان، برتر انسان اور کامل انسان کی دوسری تعبیر ہے۔ کامل انسان کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کے بانیوں کے نظریات کا خلاصہ چند بنیادی نظریات کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے:

ایک نظریہ عقل پر اعتماد کرنے والوں کا ہے —— یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے انسان کو زیادہ تر عقل کے زاویے سے دیکھا اور صرف عقل کو ہی اس کا جوہر سمجھا ہے عقل کے معنی سوچ بچار کی قوت کے ہیں۔

سوچنے کا یہ انداز قدیم فلسفیوں کا تھا جس میں ارسطو، سب تو نہیں مگر بعض قدیم فلسفی بھی شامل تھے جن میں ایک بوعلی سینا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کامل انسان کے معنی "حکیم" ہیں اور انسان کا کمال اس کی حکمت میں ہے۔ حکمت سے ان کی مراد کیا ہے؟ کیا حکمت وہ چیز ہے جسے ہم آجکل حکمت کہتے ہیں؟ نہیں —— حکمت سے ان کی مراد حکمت نظری ہے جو کل کائنات کے بارے میں ایک صحیح دریافت ہے جو علم کے علاوہ ہے۔ یہ ہستی کے ایک حصے کی دریافت ہے۔ اب اس مرحلے پر ہم حکمت اور علم میں فرق واضح کرنے کے لیے اس فرق کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

اگر آپ شہر [illegible] کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو آپ [illegible] قسم کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں —— ایک [illegible] مبہم معلومات اور [illegible] جزوی لیکن محدود معلومات ہوں گی۔ مثلاً بعض اوقات شہر [illegible]

کے بارے میں آپ کی معلومات ایک میونسپل انجینیر کی معلومات کی مانند ہوتی ہیں۔ آپ اس سے شہر کا ایک عام نقشہ کھینچنے کو کہیں تو وہ آپ کو شہر کا ایک درست نقشہ کھینچ دے گا اور وہ بتائے گا کہ وہ شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب تک کتنا ہے نیز اس کا جنوب مشرقی اور جنوب مغربی حصہ کیسا ہے۔ وہ اس کی تمام سڑکوں اور گلیوں کو بھی کاغذ پر کھینچ دے گا۔ مثلاً یہ بتا دے گا کہ وہ تحریر اس طرف شاہراہ عظیم ہے۔ وہ آپ کو شہر کے بارے میں بہت سی معلومات بہم پہنچائے گا لیکن وہ سب مبہم ہوں گی اور اگرچہ وہ آپ کو سارے شہر کے بارے میں بتائے گا لیکن اگر آپ اس سے پوچھیں جزوی تفصیلات کیا ہیں تو نہیں بتا سکیں گے۔

جبکہ دوسری طرف ایک شخص کو اس عظیم شہر کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کی گلیاں کتنی ہیں اور کتنے میدان ہیں لیکن اگر آپ اس سے ایک خاص محلے کے متعلق پوچھیں تو اسے اس جگہ کی تمام جزئیات کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس محلے میں کتنے راستے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کیسے ملے ہوئے ہیں۔ نیز فلاں کوچے میں کتنے گھر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان گھروں کے دروازوں کا رنگ بھی جانتا ہے کہ فلاں سبز ہے اور وہ سرخ ہے۔ پس اگر آپ اس شخص سے جو سارے شہر سے واقف ہے ایک خاص جگہ کے بارے میں سوال کریں تو اسے کوئی خبر نہ ہوگی اور اگر آپ اس شخص سے جو ایک خاص محلے کے بارے میں جانتا ہے سارے شہر کے متعلق پوچھیں تو اسے کچھ پتہ نہ ہوگا۔

عصر حاضر میں فلسفی اس شخص کو کہتے ہیں جو عالم ہستی کا مجموعی طور پر مطالعہ کرے ... [illegible] ... کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے ...

کے ساتھ ساتھ اس کی انتہا کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وہ ہستی کے حقائق و ان کے عوارض کو معلوم کرنا چاہتا ہے لیکن اگر آپ اسی شخص سے کسی جزوی واقعے یا تجربے یا موضوع کے متعلق سوال کریں تو اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

فلسفی کے نقطۂ نظر کے مطابق حکمت کے معنی دنیا کے بارے میں معلومات ہیں یعنی دنیا کی مجموعی ہیئت کے بارے میں۔ یہی مطلب ہے جو حکیم یا فلسفی کے ذہن کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے۔ جس طرح کہ کائنات حکیم کی عقل میں منعکس ہو گئی ہو لیکن وہ مبہم شکل میں ہو۔

گزشتہ زمانے میں کہا جاتا تھا کہ انسان کائنات ہے — دنیا کی مجموعی ہیئت اس کے ذہن میں منعکس ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفی یہ کہتے تھے:

> عقلی دنیا کے انسان کا عینی دنیا کے مطابق ہو جانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ خود اس دنیا کے مقابلے میں ایک دنیا بن جاتا ہے۔

لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہ عینی دنیا ہے اور یہ عقلی اور ذہنی دنیا ہے — جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

ہر آن کس ز دانش برد توشہ ای
جہانی است بنشستہ در گوشہ ای

جو انسان عقل و دانش کی منزل طے کر جائے وہ دراصل ایک گوشے میں سمٹی ہوئی دنیا ہے۔

فلسفیوں کے نظریے کے مطابق کامل انسان یعنی جس کی عقل کمال تک پہنچی ہوئی ہو، وہ ان معنوں میں کمال کو پہنچتا ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کا ایک نقش اس کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے، لیکن کس طرح سے؟ اب وہ نقش برہان، استدلال، منطق اور فکر کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی وہ انسان استدلال اور منطق کے قدموں سے حرکت کرتا ہوا اس مقام پر پہنچتا ہے۔ لیکن انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا اور یہ بات بھی کہتے ہیں کہ:

(۱) حکمتِ نظری: یعنی دنیا اس کی شکل میں ہو۔

(۲) حکمتِ عملی: یعنی انسان کی عقل کا اس کے وجود کی تمام جبلتوں اور قوتوں پر کامل تسلط ہو۔

اگر آپ نے کتب اخلاق کا مطالعہ کیا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان میں سے جیسے اس منطقی میدان میں اخلاق ناصری میں یعنی ہمارے علمائے اخلاق — سقراطی عقیدہ ہے اور اس کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے کہ آپ کی عقل آپ کی نفسانی خواہشات پر حاکم ہے یا آپ کی نفسانی خواہشات آپ کی عقل پر حاکم ہیں؟ کیا آپ کی عقل آپ کے غصے پر حاکم رہے یا آپ کا غصہ آپ کی عقل پر حاکم ہے؟ کیا آپ کی عقل آپ کے رجحانات پر حاکم ہے یا آپ کے رجحانات آپ کی عقل پر حاکم ہیں؟ اگر آپ حکمتِ نظری میں اس دنیا کو اسی طرح سمجھیں جیسے کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اور حکمتِ عملی میں بھی اپنی عقل کو اپنے نفس پر مسلط کریں اور آپ کا نفس اور نفسانی قوتیں آپ کی عقل کے تابع ہوں تو آپ عقل و حکمت کے اس مکتبِ فکر کے مطابق ایک کامل انسان ہیں۔

کامل انسان کا تعین کرنے کے بارے میں "مکتبِ عقل" کے علاوہ ایک اور مکتب بھی ہے اور وہ "مکتبِ عشق" ہے۔

"مکتبِ عشق" جو درحقیقت "مکتبِ عرفان" ہے، اس میں انسان کا کمال عشق میں ہے اور اس چیز میں سمجھا جاتا ہے جس تک عشق اس کو پہنچاتا ہے اور اس سے مراد خدائے تعالیٰ کی ذات سے عشق ہے۔

گویا کہ مکتبِ عشق مکتبِ عقل کے برعکس ہے جو "حرکت" کا نہیں "فکر" کا مکتب ہے۔ یہ مکتب حرکت کی بات نہیں کرتا بلکہ فکر کی بات کرتا ہے اور اس کے نظریے کے مطابق تمام ترسیر یعنی ذہن ہی کی حرکت ہے۔ جہاں تک عشق کے مکتب کا تعلق ہے وہ حرکت کا مکتب ہے لیکن یہ حرکت افقی نہیں بلکہ "صعودی" اور "عمودی" ہوتی ہے۔ تاہم بعد میں یہ "افقی حرکت" میں تبدیل ہو جاتی ہے چنانچہ جب ایک انسان کمال تک پہنچ جاتا ہے تو ضروری ہے کہ ابتدا میں اس کی حرکت عمودی اور صعودی ہو یعنی وہ خدا کی جانب حرکت اور پرواز ہو۔ مکتبِ عشق کے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بات فکر کی بات نہیں — بات عقل کی بات نہیں — بات استدلال کی بات نہیں — حقیقت انسان کی روح کی بات ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق انسان کی روح واقعی حرکت کرتی ہے اور وہ ایک معنوی حرکت ہوتی ہے — حتیٰ کہ وہ خدا تک جا پہنچتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مکتب بنیادی طور پر عقل کے مکتب کا راستہ روکتا ہے۔

ہماری ادبیات کا ایک گرانقدر حصہ "عقل" اور "عشق" کے مناظرے

سے تعلق رکھتے ہے۔ پھر جو شخص اس بحث میں وارد ہوتے ہیں وہ زیادہ تر خود اہل عرفان تھے اور انہوں نے ہمیشہ عشق کو عقل پر ترجیح مقدم قرار دیا ہے۔ یہ وہی مکتب ہے جس کے پیرو کامل انسان کے لیے اور انسان کے کمال تک پہنچنے کے لیے عقل کو کافی نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل انسان کے وجود کا ایک جزو ہے اور انسان کی عقل اس کی پوری ذات پر محیط نہیں ہے۔ عقل "چراغ" کی مانند ہے اور یہ محض ایک آلہ ہے۔ حالیہ دور میں "برگسوں" نے بھی اس بات پر بہت اصرار کیا ہے۔ اہل عشق کا کہنا ہے کہ انسان کی ذات اور انسان کا جوہر عقل نہیں بلکہ روح ہے اور روح کا تعلق دنیا سے عشق سے ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جس میں خدائے تعالیٰ کی جانب حرکت کے علاوہ اور کوئی چیز مطلوب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے مقابلے عقل حقیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس مکتب کے پیرو عشق و مستی کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ حافظ شیرازی کے بعض اشعار میں آیا ہے۔ ان کے ہاں توحید کے معنی کچھ اور ہیں۔ ان کی توحید "وحدت وجود" ہے اور ایک ایسی توحید ہے کہ اگر انسان وہاں تک پہنچ جائے تو ہر چیز کو حقیقی شکل میں اپنے اندر پاتا ہے اور بالآخر یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان — انسان بھی ہے اور خدا بھی ہے — اور اس مکتب کے مطابق ایک کامل انسان آخرکار خدا بن جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حقیقی کامل انسان خود خدا ہے اور ہر وہ انسان جو کامل انسان ہو جاتا ہے وہ خود فنا ہو کر خدا سے متصل ہو جاتا ہے۔

کامل انسان کے بارے میں ایک اور نقطۂ نگاہ بھی ہے جو نہ عقل پر تکیہ کرتا ہے اور نہ عشق پر — بلکہ وہ فقط "قدرت" پر تکیہ کرتا ہے۔ اس مکتب میں کامل انسان کے معنی مقتدر انسان کے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق انسان کے معنی قدرت کے ہیں۔ یعنی قدرت — زور اور بعینہ جس معنوں میں بھی آپ قدرت کو لے لیں۔

قدیم یونان میں کچھ لوگ ہو گزرے ہیں جنہیں سوفسطائی SOPHIST کہتے ہیں۔ انہوں نے ایسا نظریہ بڑی صراحت سے بیان کیا اور کہا ہے کہ "حق" کے معنی ہیں "زور"! اور جہاں کہیں زور ہے وہ حق ہے — جہاں کہیں قدرت ہے وہی قدرت حق ہے اور کمزوری — بے حقی اور ناحقی کے برابر ہے۔

ان کے ہاں بنیادی طور پر عدالت اور ظلم کے کوئی معنی اور مفہوم نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں "حق زور" یعنی حق زور ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ انسان کی تمام کوشش زور، قوت اور قدرت حاصل کرنے کے لیے ہونی چاہیے اور بس۔ چاہے یہ قدرت حاصل کرنے کے لیے کوئی پابندی اور کوئی حد بھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔ حالیہ ایک دو صدیوں میں مشہور جرمن فلسفی نطشے نے اس مکتب فکر کو دوبارہ زندہ کیا — آگے بڑھایا اور اس کی خوب خوب ترجمانی کی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سچائی اچھی چیز ہے، دوستی اچھی چیز ہے، امانت اچھی چیز ہے — وغیرہ، یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ انصاف اچھی چیز ہے نیکی اچھی چیز ہے — یہ بھی فضول باتیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا

معنی ہیں کہ جو کمزور ہو اسے سہارا دیا جانا چاہیے؟ اس کی بجائے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارنا چاہیے۔ اس کا اس سے بڑا کوئی اور گناہ نہیں کہ وہ کمزور ہے۔ چونکہ وہ کمزور ہے اس لیے اس کے سر پر ایک پتھر دے مارو۔

نطشے جو خدا اور دین کا مخالف ہے وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ دین کمزوروں نے اختراع کیا ہے۔ یہ کارل مارکس کے نظریے کے بالکل برعکس ہے جو کہتا ہے کہ دین طاقتور لوگوں نے اختراع کیا ہے تاکہ کمزوروں کے سامنے بند باندھ سکیں۔ اس کے مقابل نطشے کہتا ہے کہ دین کمزوروں نے اختراع کیا ہے تاکہ طاقتوروں کی طاقت کو محدود کر دیں۔ چنانچہ اس کے نظریے کے مطابق دین نے دوسری چیزوں کے ساتھ جو غداری کی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے "حسن" "سخاوت" "رحم" "مروت" "انسانیت" اور "نیکی" وغیرہ کے معانی لوگوں میں پھیلا دیے اور بعد میں طاقتوروں نے ان لوگوں سے دھوکا کھایا ہے۔ چنانچہ وہ عدالت، سخاوت، بخشش اور انسانیت کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے اپنی طاقت میں کسی حد تک کمی کر دی ہے۔

وہ کہتا ہے۔ علمائے دین نے [illegible] کہا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد لیکن تم کو نفس کی فرمانبرداری اور نفس پروری! انہوں نے کہا ـــ مساوات ـــ وہ کہتا ہے یہ غلط ہے! مساوات کے کیا معنی ہیں؟ یہ ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ لوگ کمزور ہوں اور کچھ زبردست ہوں۔ کمزور زبردستوں کی خاطر کام کریں۔ تاکہ وہ [illegible] اور [illegible] ان میں سے ایک برتر آدمی پیدا ہو!

وہ مزید کہتا ہے: اہل دین کہتے ہیں کہ عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں ـــ یہ بھی غلط ہے۔ مرد ایک برتر اور طاقتور جنس ہے۔ عورت ـــ مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اس کی پیدائش کا اور کوئی مقصد نہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ مکتب فکر بنیادی طور پر معتقد ہے اور طاقتور فرد کو برتر اور ممتاز اور کامل انسان سے تعبیر کرتا ہے اور کمال کو طاقت اور قوت میں منحصر گردانتا ہے۔ جنگل کا قانون بھی یہی ہے۔ [illegible] بالواسطہ طور پر مسلمانوں کے اندر بھی رائج ہو گئی ہیں۔ بعض اوقات ہم سے غیر مذہبی لوگ کہتے ہیں "زندگی عبارت ہے [illegible] ہماری ساری ج[illegible] نہیں ہے۔ ان تمام الفاظ "بقائے اصلح" سے مقصود یہی ہے کہ [illegible] درست ہے۔ جو بات یہاں تک پہنچی [illegible] بعض مسلمان مفکرین نے بھی [illegible] کہا ہے کہ انسانوں کے درمیان جنگ ایک ضرورت ہے اور جب تک انسان ہے جنگ ہونی چاہیے کیونکہ یہ انسان کی زندگی کا ایک [illegible] ہے۔ وہ اس بات پر اعتقاد رکھتے اور کہتے ہیں کہ خود قرآن نے بھی اس بات کی تائید کی ہے:

"اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو گرجے، کلیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے، کبھی کے ڈھا دیے گئے ہوتے۔"

(سورۂ حج۔ آیت ۴۰)

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

"اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دور نہ کرتا رہتا تو تمام روئے زمین پر فساد پھیل جاتا۔"

(سورہ بقرہ - آیت ۲۵۱)

یہاں قرآن نے جہاد کو ایک مشروع امر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے: اگر خدا بعض انسانوں کے ذریعے دوسرے انسانوں کے فساد کا سدِ باب نہ کرتا تو نہ کوئی عبادت گاہ ہوتی، نہ خانقاہ ہوتی، نہ کلیسا، یہودیوں کی عبادت گاہ ہوتی اور نہ کوئی مسجد ہوتی۔ کچھ بھی نہ ہوتا۔ لیکن انہوں نے قرآن مجید کی آیات کے مقصود کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ کیونکہ اس میں دفاع کا تذکرہ آیا ہے اور قرآن کا یہ ارشاد مسیحیت کے مقابلے میں ہے یعنی اس مسیحی پادری کے جواب میں جو کہتا ہے کہ جنگ قطعی طور پر بری ہے اور ہم "صلح کل" ہیں!

قرآن فرماتا ہے کہ جنگ ناجائز ہے لیکن وہ جنگ جو تجاوز ہو، نہ وہ کہ جو حق اور حقیقت کے دفاع کے لیے ہو۔ ہاں جناب پادری صاحب! اگر دفاعی جنگ نہ ہوتی تو آپ بھی اس خانقاہ اور گرجے میں عبادت نہ کر سکتے اور وہ (مخالف جنگ) مسلمان بھی اپنی مسجد میں عبادت نہ کر پاتا۔ وہ مسلمان جو مسجد میں عبادت میں مشغول ہے اس کی عبادت اس سپاہی کی دلیری کی مرہون منت ہے جو حق و حقیقت کا دفاع کرتا ہے۔ نیز تم مسیحی، جو گرجے میں سکون کے ساتھ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت میں مشغول ہو اور اپنے مذہبی مراسم ادا کر رہے ہو ـــــ تمہیں بھی اس

جنگجو سپاہی کا ممنون ہونا چاہیے۔

بنا بریں اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ انسان تربیت اور کمال کے ایک ایسے مرحلے پر پہنچ جائے کہ جہاں متجاوز کا کوئی وجود نہ ہو۔ جب متجاوز کا وجود نہ ہوگا تو مشروع جنگ کا بھی کوئی وجود نہ ہوگا۔ اسی لیے اسلام میں حضرت مہدیؑ کی حکومت کا تعارف ایک مثالی معاشرے کے طور پر کرایا جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جن دنوں جب میں اس مسئلے کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک عجیب داستان ہے جو اسلام کے مثالی معاشرے کو پہچاننے کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ امام مہدیؑ کے زمانے میں درندے بھی آپس میں صلح کر لیں گے اور جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ یعنی لوگ کمال کی اس حد تک پہنچ جائیں گے جہاں تجاوز کا کوئی وجود نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر جنگ لڑی جائے۔

لہٰذا یہ جو کہا جاتا ہے کہ زندگی عقیدے کی خاطر جنگ کرنے کا نام ہے۔ یعنی جنگ اور تنازع زندگی کا لازمہ ہے ـــــ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایک جملہ ہے جو امام حسین علیہ السلام سے منسوب کیا گیا ہے لیکن نہ تو اس کے معنی درست ہیں اور نہ کسی کتاب میں موجود ہے کہ جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ یہ جملہ امام حسین علیہ السلام کا ہے۔ اس کے باوجود بھی چالیس پچاس سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ یہ جملہ لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

"اِنَّ الْحَیٰوۃَ عَقِیْدَۃٌ وَّجِھَادٌ" یعنی حیات کے معنی عقیدہ رکھنے اور اس عقیدے کی راہ میں جہاد کرنے کے ہیں۔ یہی بات اہل مغرب اور فرنگیوں کے خیال سے مطابقت رکھتی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ ایک عقیدہ رکھتا ہو اور اپنے اس عقیدے کی راہ میں جہاد بھی کرے۔

قرآن اس سلسلے میں حق کا ذکر کرتا ہے اور قرآن میں مذکور جہاد اور قرآن کے نظریہ حیات کے مطابق زندگی یہ ہے کہ حق پرستی کا عقیدہ ہو اور حق کی راہ میں جہاد ہو نہ یہ کہ ایک عقیدہ ہو اور اس عقیدے کی راہ میں جہاد ہو۔

اس جگہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدہ ممکن ہے کہ حق ہو اور ممکن ہے کہ باطل ہو کیونکہ وہ ایک بند ذہن ہے۔

یہ جملہ ایک اور کمتر فکر ہے جو کہتا ہے کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک عقیدہ، ایک مقصد اور ایک مطمح نظر رکھے اور اپنے مقصد کی راہ میں پرستش بھی کرے ـــــ اب وہ عقیدہ کیا ہو، تو وہ خواہ کچھ بھی ہو، اس کی انہیں کوئی فکر نہیں ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ بڑے نپے تُلے ہیں، وہ فرماتا ہے: حق پرستی اور حق کی راہ میں جہاد ـــــ نہ کہ عقیدہ اور اس عقیدے کی راہ میں جہاد۔ قرآن کا کہنا ہے کہ پہلے تمہیں اپنے عقیدے کی اصلاح کرنی چاہیے یعنی تمہارا پہلا جہاد خود اپنے عقیدے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ تمہیں چاہیے کہ اپنے عقیدے کے ساتھ جہاد کرو اور پھر درست، صحیح اور سچا عقیدہ اختیار کرو۔ جب تمہیں حق کا پتہ چل جائے تو اس کی راہ میں جہاد کرو۔

بہرحال جہاں تک اس قول کا تعلق ہے کہ بنیادی طور پر "کامل انسان" کا مطلب "مقتدر انسان" اور "باشعور انسان" ہے تو اس کی بنیاد بھی تنازع بقاء کے اصول پر ہے۔ یہ ڈارون کا نظریہ ہے جس پر ڈارون کے فلسفے کی بنیاد قائم ہے اور وہ کہتا ہے کہ زندگی "تنازع بقاء" ہے۔ چنانچہ حیوانات ہمیشہ اپنے وجود کی بقاء کی جنگ کرتے رہتے ہیں اگرچہ اس معاملے میں انسان بھی ایسے ہی ہیں۔

ہم انسان کو اس بنا پر حیوانات کا ہم پلہ نہیں سمجھ سکتے کہ انسان کی زندگی بھی بقاء کے لیے جنگ کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ بقاء کے لیے تعاون ہو۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تنازع بقاء ہے، ان کا بیان ہے کہ تعاون کو تنازع بقاء ہی نے مسلط کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں: اگر یہ بات ہے تو پھر انسانوں کے درمیان یہ خلوص، یہ تعاون، یہ اتحاد عمل، یہ وحدت اور محبت وغیرہ کیا چیزیں ہیں؟ وہ کہتے ہیں: آپ سے غلطی ہوئی ہے کیونکہ یہی اخلاص، تعاون، محبت اور دوستی وغیرہ بھی نتیجہ تنازع کا ہوتا ہے۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسے؟ وہ کہتے ہیں کہ انسانوں کی زندگی میں بنیادی چیز جنگ ہے، لیکن جب ان کا مقابلہ کسی اپنے سے بڑے دشمن کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ ان پر دوستی مسلط کر دیتا ہے۔ یہ دوستی درحقیقت دوستی نہیں ہوتی، خالص نہیں ہوتی، حقیقت میں کوئی دوستی ہو بھی نہیں سکتی، کیونکہ یہ ایک زیادہ بڑے دشمن کے مقابلے میں ایک مشترک عمل ہوتا ہے جسے اصطلاح میں THESIS اور ANTITHESIS کہا جاتا ہے۔ جب ایک بڑے دشمن کا سامنا ہو تو شخص اس کا مقابلہ کرنے کے

یہ لوگوں میں عادتاً خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ دشمن کو یک بیک ہٹا دیں تو دیکھیں گے کہ یہ لوگ جو متحد تھے بکھر گئے ان میں گروہ بندی پیدا ہو گئی اور وہ دشمنوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اسی طرح تقسیم ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ دو فرد باقی رہ جاتے ہیں۔ جب دو فرد باقی رہ جاتے ہیں اور کوئی تیسرا ان کے مقابلے پر نہیں ہوتا تو وہ آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں: تمام دوستیاں، صلحیں، محبتیں، انسانیتیں، یگانگتیں اور یک جہتیاں وغیرہ کو انسانوں کی دشمنیاں ہی ان پر مسلط کرتی ہیں۔ یہی نظریہ اصل ہے اور تضاد اس کی پیداوار ہے۔ اس کا بچہ ہے اور اسی کی شاخ ہے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح مکتب عقل کے مقابل ایک نظریہ تھا کہ جس کا وہ منکر تھا۔ اسی طرح مکتب عشق کے مقابلے میں بھی ایک نظریہ ہے اور اس مکتب کے پیرو اس کے منکر ہیں اور اسے مطلق ناصحیح قرار دیتے ہیں۔ پھر بعض لوگوں نے قدرت کی حیثیت کو بے حد گھٹایا اور یہ سمجھا کہ بنیادی طور پر انسان کا کمال اس کی کمزوری میں ہے۔ اس مکتب میں کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جو قدرت نہ رکھتا ہو کیونکہ اگر اسے قدرت حاصل ہو تو تجاوز کرتا ہے۔ سعدی کو بھی یہ بات کہتے ہوئے ایک ایسی ہی بڑی غلط فہمی ہوئی جبکہ وہ کہتے ہیں:

من آن مورم که در پایم بمالند نه زنبورم که از نیشم بنالند

چگونه شکر این نعمت گزارم

که زور مردم آزاری ندارم

میں بھڑ نہیں کہ میرے ڈنک سے لوگ رو دیا کریں بلکہ میں وہ چیونٹی ہوں جسے وہ پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔
میں خدا کی نعمت کا شکر کیوں کر ادا کروں کہ مجھ میں لوگوں کو تکلیف دینے کی طاقت نہیں ہے۔

(گلستان سعدی۔ باب سوئم)

نہیں جناب! کیا یہ طے شدہ امر ہے کہ انسان کو چیونٹی بننا چاہیے یا زنبور ـــــ تاکہ وہ کہے کہ اگر چیونٹی ہونے یا زنبور ہونے کے درمیان انتخاب کرنا ہے تو میں چیونٹی ہونے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ چیونٹی بنو کہ ہاتھ اور پاؤں کے نیچے مسلے جاؤ اور نہ زنبور بنو کہ لوگوں کو ڈنک مارو۔ اس کی بجائے یوں کہنا چاہیے تھا:

نه آن مورم که در پایم بمالند

نه زنبورم که از نیشم بنالند

چگونه شکر این نعمت گزارم

که دارم زور و آزاری ندارم

میں بھڑ نہیں کہ میرے ڈنک سے لوگ رو دیا کریں میں وہ چیونٹی بھی نہیں ہوں کہ جسے وہ پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔
میں خدا کی اس نعمت کا شکر کیوں کر ادا کروں کہ طاقت رکھتا ہوں اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔

شکر کا مقام یہ ہے کہ انسان زور رکھتا ہو لیکن کسی کو تکلیف نہ پہنچاتا ہو۔ اگر وہ زور نہ رکھتا ہو اور کسی کو تکلیف بھی نہ پہنچائے تو یہ کوئی

میں نے اس سے پوچھا کہ عابد اور عالم میں کیا فرق ہے کہ تو عابد کو چھوڑ کر مدرسے آگیا ہے۔

اس نے جواب دیا کہ عابد صرف اپنا دامن بچاتا ہے اور عالم گنہگاروں کو نیکی کی طرف لے آتا ہے۔

انہوں نے عالم اور عابد کے فرق کے بارے میں صحیح بات کہی ہے اور یہ جو انہوں نے کہا ہے:

میں نے ایک عابد کو دیکھا کہ جس نے ایک غار میں پناہ لی ہوئی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔

جب وہ عابد ــــ سعدی کے جواب میں یہ کہتا ہے جیسا کہ آتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سعدی بھی اس کا عذر قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بگفت آنجا پری رویان نغزند
چو گل بسیار شد پیلان بلغزند

وہ کہنے لگا کہ شہر میں بہت سے حسین چہرے ہیں اور جب کیچڑ زیادہ ہو تو ہاتھی بھی پھسل پڑتے ہیں۔

یعنی شہر میں حسین لوگ ہیں اور ہو سکتا ہے کہ میری نگاہ ان پر پڑے اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکوں۔ اس لیے میں یہاں آگیا ہوں اور میں نے اپنے آپ کو غار کے دامن میں منتقل کر لیا ہے۔

انسان کے اس عمل کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ وہ پہاڑوں میں جا کر اپنے آپ کو ایک حد تک برائی سے بچا کر اپنے آپ کو گناہوں سے تو بچا سکتے ہیں لیکن یہ کوئی

بڑی بات نہیں ہے۔ وہ سینگ نہیں رکھتا کہ کسی کو ان سے مارے لیکن اگر وہ سینگ رکھتا اور کسی کو سینگ مارتا تو یہ ایک کارنامہ ہوتا۔

پھر سعدی یہ کہتے ہیں:

بدیدم عابدی در کوہساری
قناعت کردہ از دنیا بہ غاری
چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی
کہ باری بند از دل برگشائی

میں نے ایک عابد کو دیکھا کہ جس نے ایک غار میں پناہ لی ہوئی ہے اور وہاں عبادت میں مشغول ہے۔

میں نے اسے کہا کہ تم شہر میں کیوں نہیں آتے تاکہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرو۔

تاہم ایک مقام پر سعدی نے اس کے برعکس بھی کہا ہے:

صاحب دلی بہ مدرسہ آمد ز خانقاہ
بشکست عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود
تا اختیار کردی از آن این فریق را
گفت آن گلیم خویش بدر می‌برد ز موج
وین سعی می‌کند کہ بگیرد غریق را

ایک عارف خانقاہ سے مدرسہ میں گیا اور اس نے اہل طریقت کی صحبت کا عہد توڑ ڈالا۔

جناب سعدی ——— قرآن مجید نے جسے احسن القصص کی
داستان نقل کی ہے۔ قرآن کا بہترین قصہ یعنی حضرت یوسفؑ کا
قصہ!

؎ اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور صبر
کرے تو وہ ایسے نیکوکاروں کا اجر ہرگز برباد نہیں کرتا۔
(سورۂ یوسف آیت ۹۰)

خواہش کو پورا کرنے کی تمام تر اسباب موجود ہیں اور اس کے تمام وسائل اور مکانات بھی فراہم ہیں۔ ادھر محل کے سب دروازے بند ہیں اور فرار کی کوئی راہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بھی آپ اپنی عفت کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے سامنے کے بند دروازوں کو کھول دیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ کنوارے جوان ہیں اور بے انتہا خوبصورت ہیں لیکن بجائے اس کے کہ آپ عورتوں کا پیچھا کریں، خود عورتیں آپ کے پیچھے آتی ہیں۔ کوئی دن نہیں گزرتا جب سیکڑوں خط اور سیکڑوں پیغام آپ کے لیے نہ آتے ہوں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کی معزز ترین عورتیں آپ پر دل و جان سے عاشق ہو گئی ہیں۔

قرآن یوں درس دیتا ہے کہ شرائط فراہم کر دی گئی ہیں اور آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ کیونکہ آپ سے کہا جاتا ہے: یا تم میری خواہش پوری کرو یا میں تمہیں قتل کرا دوں گی اور تمہارا خون بہا دوں گی۔

تب حضرت یوسف علیہ السلام کیا کرتے ہیں؟ آپ اس فعل سے باز رہتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ اے میرے پالنے والے! جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے
خواہش رکھتی ہیں اس کی بہ نسبت قید خانہ مجھے زیادہ
پسند ہے۔ اگر تو ان عورتوں کے فریب کو مجھ سے دفع
نہ فرمائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔
(سورۂ یوسف آیت ۳۳)

اے پروردگار! یہ عورتیں مجھے جس چیز کی دعوت دیتی ہیں اس سے میرے لیے قید خانہ بہتر ہے۔ اے خدا! تو مجھے قید خانے بھیج دے اور ان عورتوں کے جنگل میں گرفتار ہونے سے بچا لے۔ میں شہوت کے عمل کی طاقت رکھتا ہوں لیکن پھر بھی وہ کام نہیں کرتا۔

لہٰذا انسان کا عمل انسان کی کمزوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہمارے ہمت سے دل تھا ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ انسان کا عمل اس کی کمزوری میں سمایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بابا طاہر عریان ہمدانی بھی یہ اشعار یوں کہتے ہیں:

ز دست دیدہ و دل ہر دو فریاد
ہر آنچہ دیدہ بیند دل کند یاد
بسازم خنجری نیشش ز فولاد
زنم بر دیدہ تا دل گردد آزاد

میں اپنی آنکھ اور دل کے خلاف فریادی ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں، میرا دل اس چیز کی خواہش کرتا ہے۔ لہٰذا میں ایک خنجر چاہتا ہوں تاکہ اس کے ساتھ اپنی آنکھ پھوڑ دوں اور میرے دل کو سکون نصیب ہو۔

ارے واہ رے ۔۔۔ بہت خوب، آپ سب چیز سنتے ہیں اور آپ
کو ان کی خواہش کرنے لگتا ہے لہذا آپ کو ایک تجربہ ممکن کرنا چاہیئے
تاکہ اپنا کان کاٹ ڈالیں۔

انہوں نے عجیب کامل انسان تیار کیا ہے ۔۔۔ یا بظاہر کامل انسان
نظر آتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جو نہ پاؤں رکھتا ہے، نہ ذہن ۔۔۔
نہ کان رکھتا ہے نہ آنکھیں ۔۔۔ نہ اعضائے [illegible] رکھتا ہے۔ غرض وہ
کچھ بھی نہیں رکھتا۔

جیسے یہ روایات کے کوئی مقدار ہیں [illegible]
[illegible] خلاق بہت سمجھتے ہیں لیکن [illegible] چاہیے کہ [illegible]
[illegible] کیونکہ وہ [illegible] میں رہتا ہے
جب [illegible] کا [illegible] جیسی مکتب سے [illegible]
اسے یقین ہو جاتا ہے [illegible]
[illegible] کیونکہ [illegible] غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔
[illegible] ایک گوشہ [illegible] غلط [illegible] جیسی [illegible]
[illegible] ایک گوشہ [illegible] غلط فہمی [illegible]
معنوی بھی ایک گوشہ [illegible] غلط فہمی میں [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible]
ایک گوشہ [illegible] کی طرح [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible] کا ایک گوشہ [illegible] اور عقلی کی [illegible]۔
پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے [illegible] ایک بہتر [illegible]
ایک بہتر کی سوچ کے [illegible] ہو اور پھر بھی [illegible] کا مکتب [illegible]

جنہ اور زندگی پر ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مفکرین بچے ہیں اور آنحضرتؐ
ایک معلم ہیں جو بڑی بات آخر میں کہتے ہیں اور وہ بات کتنی بلند ہوتی ہے۔
بہرحال مکتبِ قدرت بھی ایک مکتب ہے اور مکتبِ جو اس کے
مقابل کا مکتب ہے۔

کامل انسان کے بارے میں ایک اور مکتب بھی ہے جسے مکتبِ
"محبت" کہا جا سکتا ہے دوسرے مکتبِ معرفت "یعنی" معرفتِ
نفس" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مشرقی [illegible] میں [illegible]
[illegible] بڑے بڑے [illegible] موجود تھے۔ اس وقت بھی بہت [illegible]
[illegible] موجود ہیں جن کا [illegible] ترجمہ ہو چکا ہے۔ [illegible]
بھی موجود ہے جو بہت [illegible] ہے۔

چند سال پہلے ہمارے بزرگ [illegible] علامہ [illegible]
مذکورہ [illegible] پڑھی تو وہ اس کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ [illegible]
[illegible] میں بڑے بلند مطالب ہیں جن کی طرف [illegible] توجہ دی
گئی ہے۔

اس مکتب میں انسان کے تمام کمالات کا محور [illegible]
ہے۔ یعنی اے انسان! اپنے آپ کو پہچان ۔۔۔ اس پہلے اپنے آپ کو
[illegible] ۔۔۔ سقراط نے بھی کہا ہے کہ پہلے اپنے آپ کو پہچانو۔ یہ تمام
پیغمبروں نے بھی اور پھر پیغمبرِ اسلامؐ نے بھی فرمایا ہے: اپنے آپ کو پہچان!

جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو
پہچان لیا۔ (غرر الحکم - حرف میم)

لیکن اس حکمت میں فقط اسی ایک نکتے پر تکیہ کیا گیا ہے کہ "اپنے آپ کو پہچانو"۔ مشہور کانگریسی رہنما مہاتما گاندھی کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان کے مقالات اور خطوط شامل ہیں اور اس کا نام ہے "یہ ہے میرا مذہب"۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں ایک جگہ گاندھی کہتے ہیں:

میں نے اپنشدوں کے مطالعہ سے تین اصول اخذ کیے ہیں
اور یہ تمام عمر میری زندگی کا دستور العمل رہے ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ فقط ایک حقیقت وجود رکھتی ہے اور وہ "نفس کا پہچاننا ہے"۔ فارسی ترجمے میں کہا ہے "شناختن ذات است" یعنی ذات کا پہچاننا ہے۔ لیکن ترجمے میں غلطی ہوئی ہے اور وہ غلطی اس لیے ہوئی ہے کہ ذات اور نفس ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ فارسی ترجمے میں کہنا چاہیے تھا "شناختن نفس"۔ اسی بنا پر گاندھی مرتبہ اور مغرب کی دنیا پر بڑے عمدہ انداز سے حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے: فرنگی نے دنیا کو پہچانا اور اپنے آپ کو نہیں پہچانا —— چونکہ اس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس لیے اپنے آپ کو بھی تباہ کیا اور دوسروں کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ یہاں اس نے عجیب اور غیر معمولی طور پر عالمانہ انداز میں داد سخن دی ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو پہچان لے وہ خدا کو بھی پہچان لیتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی پہچان لیتا ہے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ فقط ایک طاقت وجود رکھتی ہے اور وہ "اپنے آپ پر تسلط" کی طاقت ہے۔ جو شخص اپنے آپ پر مسلط ہو جائے اس کا

دوسری چیزوں پر تسلط صحیح اور درست ہے۔ یعنی وہ مسلط ہو جاتا ہے اور اس کا مسلط ہونا درست بھی ہوتا ہے۔ نیز فقط ایک نیکی وجود رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کے لیے اسی چیز کو دوست رکھے جسے وہ اپنے لیے دوست رکھتا ہے اور دوسروں کے لیے وہی چیز پسند کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

معرفت سے ان کا مقصود معرفت نفس (اپنے آپ کو پہچاننا) ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہندی فلسفے میں "مراقبہ" یعنی "اپنے اندر اترنے" کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ اب میں اس مکتب اخلاق کی تشکیل، عملیاً کرتی ہے اور اس میں کچھ دوسری چیزیں شامل کی گئی ہیں ان کا ذکر نہیں کرتا اور مختصراً کہتا ہوں کہ اس مکتب کی بنیاد "نفس کی پہچان" اور "مراقبے" پر ہے۔

ایک شخص کامل انسان کو اپنے طبقے میں تلاش کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ جو انسان طبقوں میں اور بالخصوص اونچے طبقوں میں ہو وہ ایک معیوب انسان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقی معاشرے میں بھی ہی درست اور صالح انسان کا وجود نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک کامل انسان یہی بے طبقہ انسان وہ انسان ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ ایک جیسی حالت میں زندگی بسر کرے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مکاتب بھی ہیں جو زیادہ تر انسان کی آزادی اور آزادی کے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کا نظریہ جو انسان کی اجتماعی آگاہی کا حامل ہوتی ہے۔ مثلاً اگزیسٹینشلزم (Existentialism) کا مکتب جو زیادہ تر اجتماعی آزادی

[illegible] کا بھی وہ [illegible] پر [illegible] دیتا ہے۔ ان کے نزدیک کامل انسان کے معنی آزاد و آگاہ [illegible] انسان کے ہیں اور آزادی کا [illegible] جنگ و جدل ہے یہ جو [illegible] ایک غلط مکتب ہے۔

مکتبِ انتفاع

[illegible] ممکن ہے کہ ان [illegible] مکتب فکر بھی وجود رکھتا ہے اور وہ مکتب [illegible] ہے۔ [illegible] مکتب [illegible] قدرت [illegible] قریب ہیں۔ [illegible] ہے کہ کوئی انسان [illegible] کامل انسان [illegible] تک پہنچتا ہے۔ [illegible] کامل انسان کے معنی [illegible] انسان [illegible] بھی چاہتے ہیں تو [illegible] کوشش کریں [illegible] کریں گے [illegible] کامل انسان ہوں گے۔

لہٰذا [illegible] وہ [illegible] کو [illegible] انسان کا کمال سمجھتے ہیں۔ [illegible] فطرت کی [illegible] سے تعبیر کرتے ہیں اور فطرت کی [illegible] پر تسلط [illegible] کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے اور وہ اس سے بہرہ مند ہو۔ [illegible] بات پر [illegible] ہے کہ انسان کے لیے علم کی اہمیت بھی [illegible] نہیں بلکہ ایک وسیلے کے طور پر ہے یعنی علم انسان کے لیے فطرت پر تسلط پانے اور اسے مسخر کرنے کا ایک وسیلہ ہے کیونکہ جب انسان فطرت کو تسخیر کر لیتا ہے تو اس سے بہتر طور پر بہرہ مند، مستفید اور [illegible] رہتا ہے۔

[illegible] انسان کو کمال تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ [illegible] کریں [illegible] کے مقام تک لے جائیں [illegible] کے علاوہ کسی [illegible] نہیں ہے [illegible] کی [illegible] کی حالت [illegible] رکھتے۔

[illegible] نظریات کا ایک سلسلہ [illegible] ہیں۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق [illegible] کریں گے۔ اور [illegible]

[illegible] انسان [illegible] ہیں [illegible] یہ ہے کہ وہ موت کا سامنا کیسے کرتا ہے یعنی جب موت آتی ہے تو وہ کیسے سوچتا ہے اور موت سے کتنا خوفزدہ ہوتا ہے۔ موت کا خوف انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور اس کی بہت سی بدبختیاں موت کے خوف سے [illegible] ہیں۔ یہ موت کا خوف ہی ہے جس کی وجہ سے انسان پستی، ذلت [illegible] دوسری مصیبتیں برداشت کرتا ہے۔

اگر کوئی شخص موت سے نہ ڈرے تو اس کی زندگی سراسر [illegible] جاتی ہے۔ [illegible] عظیم اور بہت ہی عظیم انسان وہ ہوتے ہیں جو موت کا سامنا کرنے

وقت انتہائی دردمندی کے ساتھ اور اس سے بھی زیادہ کشادہ پیشانی کے ساتھ موت کو گلے لگاتے ہیں۔ لیکن ہر موت کو یہ خوشی نصیب نہیں۔ جو بندہ کسی ہدف کی خاطر ہو کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تبلیغ حق اور فرض کی ادائیگی میں شہادت خوش آیند ہے۔

"میری نظر میں یہ موت خوش نصیبی ہے اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا ایک اذیت ہے۔" (حسینؑ ابن علیؑ)

اولیائے حق کے علاوہ اس طرح موت کا سامنا کرنے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ ان دونوں کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ موت ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہونے یا امام حسین علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق ایک پل عبور کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے جیسا کہ عاشورا کو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"موت ایک پل کے علاوہ کچھ نہیں جس پر سے تم گزر رہے ہو۔"

اے میرے ساتھیو! ہمارے سامنے ایک پل ہے۔ جس پر سے ہمیں گزرنا ہے اور اس کا نام "موت" ہے۔ جب ہم اس پل پر سے گزر جائیں گے تو ایک ایسی جگہ پہنچیں گے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جوں جوں موت نزدیک آ رہی تھی آپ کا چہرہ اتنا ہی بشاش ہوتا جا رہا تھا۔

ایک شخص عمر سعد کے لشکر کا اور وقت کے یزید کا کارندہ تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور امام حسینؑ شہید ہو چکے تھے۔ ان آخری لمحات میں ان پیشہ ور جنگجو لوگوں کی طرح جو ایسے موقع پر لوٹ مار کا کام کرتے ہیں۔ جب انہیں کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ اس نے عمر سعد سے درخواست کی اور کہا:

اب میں حسینؑ ابن علیؑ کو پانی پلا دوں یا نہ پلاؤں۔ انہیں شہید تو ہو ہی جانا ہے لہٰذا مجھے اجازت دو کہ میں ان کے لیے کچھ پانی لے جاؤں۔ اگرچہ اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا لیکن جب وہ پانی لے کر گیا تو دیکھا کہ ایک بدبخت لعین دشمن، امام علیہ السلام کا مقدس سر لیے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ جو شخص امامؑ کے لیے پانی لایا تھا وہ کہتا ہے:

"امام علیہ السلام کے چہرے کی بشاشت نے مجھے فرصت ہی نہیں دی کہ ان کے مارے جانے کے متعلق سوچوں — یعنی اس حد تک کہ آپ کا سر کٹ چکا تھا — پھر بھی آپ کا چہرہ بشاش تھا..."

پس کامل انسان وہ شخص ہے جس کے چہرے پر مردانگی اور شجاعت کا کوئی اثر نمایاں ہو۔ علیؑ وہ انسان ہیں جو ارتقائی مراحل اور مناصب کے لحاظ سے سب سے اونچے درجے پر ہیں۔ یہ سب سے نچلا درجہ کیا ہے؟ انسانی نقطۂ نگاہ سے سب سے نچلا درجہ محنت مزدوری کا ہے۔ یعنی وہ وقت کہ جب انسان محنت کرتا ہے اور اس کی اجرت لیتا ہے۔ چنانچہ امام علی علیہ السلام بھی ایک ایسے شخص ہیں جو مزدوری کرتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی نہیں کہ ان کے پاس کچھ رہ جاتا تھا — نہیں — بلکہ علیؑ کے پاس جو کچھ ہوتا حتیٰ کہ جنگی غنائم بھی خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ پھر دوسرے ہی دن کام کے لیے سر بکف ہو جاتے اور محنت سے روزی کماتے تھے۔

وہ تو نچلے درجے کا تذکرہ — اب دیکھیے کہ معاشرتی مراحل میں سب سے اونچا درجہ حکومت اور خلافت کا ہے۔ یہ تاریخ ہے کہ علیؑ کی

جو کہتے ہیں: علیؑ نے کارل مارکس کا فلسفہ اُلٹ دیا۔ کیونکہ آپ جس طرح عمل میں سوچتے تھے، تجویزوں میں بھی اسی طرح سوچتے تھے۔ یعنی آپ کی طبع میں تجویز اور عمل کی اقامت سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

وہ کہتے ہیں: علیؑ محنت مزدوری کرتے ہوئے بھی ویسے ہی سوچتے تھے جیسے خلافت کے عہدے پر ہوتے ہوئے سوچتے تھے۔ بس اسی بنا پر انہیں "کامل انسان" کہا جاتا ہے۔

ہم یہاں کس چیز کے لیے جمع ہوتے ہیں؟ یہاں ہم ایک کامل انسان کا سوگ منانے بیٹھے ہیں۔ دیکھیے اب سبب کہ علیؑ کو رات کے وقت دفن کیا گیا ——— کیوں؟ اس لیے کہ جس طرح آپ غیر معمولی طور پر مخلص دوست رکھتے تھے اسی طرح آپ کے بدترین دشمن بھی تھے۔ ہم نے اپنی کتاب "جاذبہ و دافعہ" میں ثابت کیا ہے کہ ایسے انسان جہاں غیر معمولی طور پر قوی کشش رکھتے ہیں وہاں اسی نسبت سے رد کرنے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ وہ جتنا مخلص دوست رکھتے ہیں، جو ان پر جان قربان کر دینا معمولی بات سمجھتے ہیں ——— لیکن وہ دشمن بھی ایسے رکھتے ہیں جن سے زیادہ خونخوار ڈھونڈے نہیں ملتے۔ ان دشمنوں میں، مخصوص داخلی دشمن یعنی مقدس مآب دشمن خوارج تھے جو دینی اعتقاد سے آراستہ اور باایمان ہوتے ہوئے بھی نرے جاہل تھے۔ ان کے متعلق خود علیؑ نے اعتراف کیا تھا کہ وہ مومن تو ہیں مگر ہیں جاہل! آپ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: آپ خوارج (مارقین)، معاویہ کے ساتھیوں (قاسطین)، ناکثین پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان خوارج کو میرے بعد قتل نہ کرنا۔ کیونکہ وہ اس معاویہ کے

ساتھیوں سے مختلف ہیں۔ یہ حق چاہتے ہیں لیکن احمق ہیں جب کہ وہ حق کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر حق کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔

علیؑ کے اتنے دوست ہوتے ہوئے بھی انہیں رات کو خفیہ طور پر کیوں دفن کیا گیا؟ ہاں ——— آپ کے جسد مبارک کو خوارج کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ وہ کہتے تھے: علیؑ مسلمان نہیں ہیں۔ اور اس بات کا خطرہ تھا کہ مبادا وہ رات کے وقت آپ کی قبر کھود ڈالیں اور آپ کی میت باہر نکال لیں۔

امام علی علیہ السلام ۴۰ھ میں شہید ہوئے اور امام صادقؑ نے ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ چنانچہ اس واقعہ سے پورے سو سال بعد ——— یعنی امام صادقؑ کے آخری دور تک سوائے ائمہ علیہم السلام اور کچھ اصحاب کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ علیؑ کو کہاں دفن کیا گیا ہے۔

رمضان کی ۲۱ویں رات کو امام حسن علیہ السلام نے جنازے کی ایک شبیہ بنا کر اسے آراستہ کیا اور فرمایا: اس کو مدینے لے جاؤ اور وہاں دفن کر دو۔ تب عام لوگوں نے خیال کیا کہ امام علی علیہ السلام کو یہاں سے مدینے جا کر دفن کیا گیا ہے۔ پھر اسی رات فقط علیؑ کی اولاد اور کچھ خاص شیعوں نے آپ کو دفن کرنے کے کام میں شرکت کی۔ اس کے بعد وہ لوگ کبھی کبھی آتے اور کوفہ کے نزدیک موجودہ مقام پر اپنے مولا کے مدفن کی زیارت کرتے تھے۔ امام صادقؑ کے زمانے میں خوارج کا خاتمہ ہو گیا اور وہ خطرہ دور ہو گیا۔ جب آپ نے صفوان [illegible] کو حکم دیا کہ وہ مدفن علیؑ کی جگہ پر

بطور علامت ایک قبہ سا دے۔ اس کے بعد سب کو معلوم ہوگیا کہ علی کا مدفن کہاں ہے۔ اب لوگ امیر المومنین کے مزار کی زیارت کے لیے نجف آنے لگے اور آتے رہیں گے۔

ہمارے مولا کے جنازے کے ساتھ صرف تھوڑے سے لوگ تھے جن میں آپ کے چند اصحاب شامل تھے۔ ان میں سے ایک بزرگوار صعصعہ بن صوحان بھی جو امیرالمومنین کے خاص اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ بڑے اچھے خطیب تھے اور امیرالمومنین کے حضور اشعار پڑھا کرتے تھے۔ جاحظ نے البیان میں ان کے بارے میں کچھ واقعات نقل کیے ہیں۔

میں اس سے زیادہ ذکر مصائب نہیں کرسکتا اور انہیں چند جملوں پر اکتفا کروں گا۔ پس جس وقت امام علی کو دفن کیا گیا تو سب پر غیر معمولی غم و اندوہ طاری ہوگیا اور مارے غم کے ان کے گلے رندھے ہوئے تھے۔ پھر جناب صعصعہ اس حال میں آگے بڑھے کہ ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ انہوں نے مولا علی کی قبر سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اسے سر پر ڈال دی۔ پھر انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھا اور اپنے شہید امام سے یوں مخاطب ہوئے:

میرے مولا! آپ نے کتنی سعادتمندانہ زندگی گزاری
اور کتنے سعادتمند ہوکر اس دنیا سے گئے۔

آپ کی ولادت خدا کے گھر میں ہوئی اور آپ خدا کے گھر میں ہی شہید ہوئے۔ یا علی! آپ کتنے عظیم تھے اور ہم سب لوگ کتنے کمتر ہیں۔ اگر لوگ آپ کے منصوبوں پر عملدرآمد کرتے تو عالم ہوتا:

یعنی ان کے لیے زمین و آسمان سے آبادی اور روشنی،

نعمتیں بڑی کثرت سے آتیں۔

لیکن افسوس کہ لوگوں نے آپ کی قدر نہیں پہچانی اور سمجھا نہیں کہ آپ کے احکام پر عمل کرتے ـــ انہوں نے آپ کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ پھر خونخوار ہوکر انہوں نے آپ کو پھٹے ہوئے سر کے ساتھ فردوس بہشت کی جانب روانہ کر دیا۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم
وصلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین

چھٹی نشست

کامل انسان اور مختلف نظریات (۱)

اللہ وہی خدا ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

قدماء کی اصطلاح میں "کامل انسان" اور آجکل کی اصطلاح میں "مثالی انسان" کی پہچان بڑی اہم اور ضروری ہے۔ ہر مکتب فکر میں تربیت اور اخلاق کا مقصد اس کے نقطۂ نظر سے "کامل انسان" یا "مثالی انسان" کی پہچان پر مبنی ہے۔

کامل انسان کے بارے میں انسان کی رائے جاننے کے لیے ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلے میں جو مکاتب فکر موجود ہیں ان میں سے ہر ایک کا جائزہ لیں، اس پر تفصیلی بحث کریں اور پھر ہر ایک کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر بیان کریں۔ گزشتہ

اب ہم نے مجمل طور پر مختلف مکاتب کا ذکر کیا۔ ذیل میں ہم مکتب عقل کے نظریات سے اپنی بحث شروع کرتے ہیں:

ہم نے عرض کیا تھا کہ قدیم فلاسفروں کے عقیدے کے مطابق انسان کا معیاری جوہر اس کی عقل ہے۔ جس طرح انسان کا بدن اس کی شخصیت کا جزو نہیں اسی طرح اس کی روحانی اور حیاتی قوتیں اور [illegible] میں سے کوئی بھی اس کی حقیقی شخصیت کا جزو نہیں ہے۔ انسان کی حقیقی شخصیت اس کی وہی قوت ہے جو سوچتی ہے اور وہی سوچنے والا "انسان" ہے۔ یعنی وہ جو سوچتا ہے نہ وہ جو دیکھتا ہے ــــ آنکھ بھی ہے وہ اس سوچنے والی ہستی کا ایک آلہ ہے ــــ نہ وہ جو تخیل کا عمل کرتا ہے، یہ قوت بھی اس سوچنے والے کا ایک آلہ ہے۔ اسی طرح وہ عنصر بھی حقیقی انسان نہیں جو کسی کو چاہتا ہے، دوست رکھتا ہے، شہوت اور غصہ رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان کا اصلی جوہر سوچتا ہے اور کامل انسان وہ ہے جو سوچنے میں کمال کی حد تک پہنچ گیا ہو۔ پھر سوچنے میں کمال کی حد تک پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے تمام ہستی کو جیسا کہ وہ ہے ــــ [illegible] دریافت اور معلوم کر لیا ہو۔

اس مکتب میں کچھ اور چیزیں بھی قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ انسان کا حقیقی جوہر در حقیقت اس کی عقل ہے۔ دوسری یہ کہ عقل ایک ایسی قوت ہے جو اس بات کی قدرت رکھتی ہے کہ دنیا کو جیسی کہ وہ ہے دریافت کرے اور دنیا کی حقیقت کو کسی حد تک اپنے اندر منعکس کرے۔ گویا وہ ایک آئینہ ہے جو سب کی تشکیل کو اپنے اندر صحیح اور درست طور پر منعکس کر سکتا ہے۔ جس سلسلے میں [illegible] یہ نظریہ قبول کر رہے ہیں۔ ان کا اعتقاد [illegible] ہے کہ

اسلامی ایمان یعنی وہ ایمان جو قرآن میں آیا ہے یہی ہے یعنی دنیا جیسی کہ وہ ہے اس کی عام طور پر پہچان، دنیا کی مبدء کی پہچان، دنیا کی روش کی پہچان، دنیا کے لئے [illegible] کی پہچان اور اس بات کی پہچان کہ دنیا کس منزل کی جانب لوٹ رہی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ جو قرآن میں خدا پر ایمان اور خدا کے فرشتوں پر ایمان کو تو دونوں کو واسطے اور مرحلے ہیں [illegible] کے حامل ہوتے اور اس بات پر ایمان کہ خدا نے دنیا کو یونہی نہیں چھوڑ دیا، خدا اس نے انبیائی رہنمائی کی ——— اور یہی نوع انسان کی راہنمائی پیامبر کے ذریعے کی ہے۔ علاوہ ازیں اس بات پر ایمان کہ ہر چیز خدا کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے کہ وہ خدا کی طرف سے آئی ہے اور خدا کی طرف ہی واپس جاتی ہے۔ [illegible] یہی کا نام معاد ہے ——— یعنی جس معاد کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ یہی ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ان حکماء نے اپنی تعبیر میں ——— ایمان کی تفسیر "معرفت" پہچان اور حکمت کی شکل میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایمان کے معنی پہچان کے ہیں۔ لیکن دنیا کی یہ پہچان ایک فلسفیانہ اور حکیمانہ پہچان ہے، یہ علمی پہچان نہیں کہ جو ایک ادھوری پہچان ہوتی ہے، فلسفیانہ، کامل اور حکیمانہ پہچان کے معنی یہ ہیں کہ ہم دنیا کے مبداء اور منتہا، ہستی کے مراتب اور دنیا کے پورے طرز عمل کو دریافت کریں اور جان لیں۔ چند ایک ایسے مکاتب فکر ہیں جو ہمیشہ عقلیت پسندوں کے اس مکتب کے خلاف برسرپیکار رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلا مکتب جو ان کی ضد ہے اور جس نے اسلام کے دور میں ان کے خلاف جنگ کی ——— وہ مکتب اشراق یعنی "عرفا" اور

"اہل عشق" کا مکتب ہے جس کی تشریح ہم بعد میں کریں گے۔

ایک اور مکتب "اہل حدیث" کا ہے کہ حاری اور اہل حدیث عقل کی اس اہمیت سے انکار کرتے ہیں جو انہوں نے اسے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل کو وہ قدر و قیمت حاصل نہیں جو تم اسے دیتے ہو۔ اس کے بعد یورپ کے جدید دور میں عقلیت پسندوں کے مقابلے پر مکتب حس یعنی "مکتب حسیون" پیدا ہوا ہے۔ [illegible] اور حسیون نے کہا، عقل وہ قدر و قیمت نہیں رکھتی جس کا تم اسے اہل سمجھتے ہو۔ ہاں عقل کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی بلکہ وہ حس کی تابع ہے اور انسان میں مادی چیزاس کے حواس اور محسوسات ہیں۔ اساس و بنیاد [illegible] [illegible] زیادہ آگاہ کرتے ہیں وہ اس کے بارے میں کوئی کام کی ہوتی ہے۔

اب ہم [illegible] کو بھی جس میں [illegible] اس کے بعد [illegible] کا ذخیرہ [illegible] اور [illegible] جاتا ہے [illegible] جائے گی [illegible] جائے گا اور بعد میں اسے ایک خاص ترتیب کی شکل میں مرتب کیا جائے گا۔ عقل بھی ایک [illegible] حس سے [illegible] اس کے کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ جو اس کے رستے سے [illegible] کو [illegible] اس پر کچھ کام، کام [illegible] ہے۔ بلکہ اس میں شک نہیں کہ عقلیت پسندوں کا مکتب پورے طور پر [illegible] رہے ہیں [illegible] اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاہم بالفعل ہم عقلیت پسندوں اور دوسرے مکاتب کا باہم موازنہ کرنے اور ان کا تفصیلی مطالعہ کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمیں یہاں

اسلام کا نظریہ بیان کرتا ہے۔

عقلیت پسندوں کے مکتب میں کچھ باتیں پائی جاتی ہیں جن پر ہم [illegible] ایک [illegible] کے طور پر [illegible] چاہتے ہیں کہ آیا وہ اسلام کے نظریے سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں؟

عقلیت پسندوں کی [illegible] "عقل مرکزیت" [illegible] ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے [illegible] انسانی عقل کی [illegible] قدرت [illegible] کہ [illegible] کو درک کر سکے [illegible] تحقیقی [illegible] ہیں جو عقل کو اس قدر معتبر نہیں سمجھتے [illegible] اسلامی علوم سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عقل معتبر ہے [illegible] کچھ اسلامی علوم میں [illegible] عقل [illegible] ایسی [illegible] طریقے سے [illegible] دوسرے دین میں دکھائی نہیں دیتی [illegible] کی جانب سے عقل [illegible] اور عقل کے [illegible] اور معتبر ہونے کی [illegible] نہیں کی گئی۔

آپ اسلام کا مقابلہ مسیحیت سے کریں [illegible] مسیحیت

ایمان کی قلمرو میں عقل کی دخل اندازی [illegible] نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جہاں انسان کو کسی چیز پر ایمان لانا ہو وہاں وہ سوچنے کا حق نہیں رکھتا کیونکہ سوچنا عقل کا کام ہے اور وہ ان مسائل میں دخل اندازی کا حق نہیں رکھتی۔ جس چیز پر ایمان رکھنا ضروری ہو اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے اور عقل کو چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔

ایک با ایمان پادری [illegible] لوگوں کے ایمان کے محافظ کا فرض یہ ہے کہ

وہ عقل کی [illegible] اور [illegible] کے ایمان کی قلمرو میں دخل دینے کا سد باب کرے ___ اور در حقیقت یہی مسیحی تعلیمات کی بنیاد ہے۔

لیکن اسلام میں اس معاملے کی صورت اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں عقل کے علاوہ کسی چیز کو اصول اسلام اور اصول دین میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔ یعنی اگر آپ سے اصول دین [illegible] کے بارے میں پوچھا جائے تو آپ کہیں گے کہ وہ خدا [illegible] کے وجود کی توحید ہے۔ پھر اگر پوچھا جائے کہ آپ کس دلیل کی بنا پر [illegible] تو اسلام آپ سے [illegible] کے علاوہ کوئی اور [illegible] قبول نہیں [illegible] نہیں [illegible] میں نے [illegible] کہ خدا ایک ہے [illegible] کوئی دلیل بھی ہیں [illegible] آپ کو اس سے کیا [illegible]؟ آپ [illegible] آپ کا کیا کام؟ میں نے اپنی [illegible] حقیقت کے بارے میں جو [illegible] پیدا کیا ہے۔ [illegible] کے قول سے [illegible] میں نے [illegible] دیکھا [illegible] اسلام کہتا ہے: نہیں ___ جس عقیدے کی بنیاد [illegible] تقلید یا [illegible] پر ہو وہ قابل قبول نہیں ہے۔ بس سوائے [illegible] تحقیق کے [illegible] عقل سے دلیل اور برہان کے ساتھ مطلب کو دریافت کیا ہو [illegible] کوئی دوسری چیز قبول نہیں ہے۔

مسیحیت کے اصول میں ___ عقل کے داخلے کی حد تک ایک ممنوعہ علاقہ ہے اور ایک مسیحی پادری کا فرض ہے کہ وہ عقلی اور فکری قوتوں کے حملے سے اس علاقے کی حفاظت کرے لیکن اسلام میں ایمان کا علاقہ ایک

ایسا عطیہ ہے جو عقل کے لیے مخصوص اور اس کے اختیار میں ہے۔ جس کی راہ عقل کے علاوہ کوئی دوسری طاقت اس علاقے میں داخلے کا حق نہیں رکھتی۔

اسلامی مآخذ میں اس موضوع پر غیر معمولی طور پر بلند اور عمیق باتیں کہی گئی ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید ہے جو جا بجا عقل کی بات کرتا ہے اور بہت آیات ہیں اس بات میں کامیاب ہو جاؤں کہ ایک حدیث کے ضمن میں قرآن کی چند آیات پڑھوں۔ یعنی امام موسیٰ کاظمؑ کی وہ حدیث پڑھوں جس میں قرآن سے استناد کرتے ہوئے عقل کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ انشاء اللہ!

علاوہ ازیں ہماری روایات اور احادیث میں عقل کو تمام عبادتوں کا راہنما قرار دیا گیا ہے کہ جب آپ حدیث کی کتابیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ ان کا پہلا باب ہی "کتاب العقل" ہے۔ مثلاً اگر آپ اصول کافی کو دیکھیں تو اس کی پہلی کتاب "کتاب العقل" ہے۔ چنانچہ کتاب العقل میں آپ اول سے آخر تک دیکھیں گے کہ اہل تشیع کی احادیث عقل کی حمایت کرتی ہیں۔ اسی ذیل میں امام موسیٰ کاظمؑ کی ایک ایسی تعبیر ہے جو غیر معمولی طور پر عجیب ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

خدا کی دو حجتیں ہیں جس کے دو پیغمبر ہیں۔ ایک پیغمبر باطنی ہے وہ انسان کی عقل ہے اور دوسرا پیغمبر ظاہری ہے

(اصول کافی جلد ۱ کتاب العقل والجہل)

ظاہری پیغمبر انسانوں میں سے ہیں اور انہوں نے لوگوں کو دعوت حق دی ہے۔ چنانچہ خدا کی دو حجتیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسری کی تکمیل کرتی ہیں یعنی اگر عقل ہو اور انبیاء نہ ہوں تو انسان کبھی اپنی خوش بختی کا راستہ

طے نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر انبیاء ہوں مگر انسان عقل نہ رکھتا ہو تو بھی وہ خوش قسمتی کے راستے تک نہیں پہنچ پاتا۔ گویا کہ عقل اور پیغمبر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک کام سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر عقل کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس اس قسم کی بہت زیادہ تعبیریں ہیں۔ مثلاً "عقل مند کا سونا جاہل کی عبادت سے بہتر ہے" "عقلمند کا کھانا جاہل کے روزہ رکھنے سے بہتر ہے" "عقلمند کی خاموشی اور سکون جاہل کی حرکت سے بہتر ہے" نیز خدا نے کوئی پیغمبر مبعوث نہیں کیا مگر یہ کہ پہلے اس کی عقل کو اس درجہ کمال کی حد تک پہنچایا۔ نبی کی عقل اس کی ساری امت سے زیادہ کامل تھی۔

ہم رسول کریمؐ کو "عقل کل" کہتے ہیں اور یہ بات مسیحیت کے ذوق کے ساتھ ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔ درحقیقت مسیحیت میں عقل اور دین کا دائرہ الگ الگ ہے جبکہ ہم آنحضرتؐ کو "عقل کل" کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اس حدیث شریف کے ذیل میں عقل کی اہمیت یعنی حجیت عقل کے بارے میں یہ ہیں کہ عقل ایک صحیح معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ لہٰذا علاوہ اس مطلب کی تعلیم دینے کے یہ تائید کرتا ہے جو ہمارے نظریے کا ایک حصہ ہے۔

فلسفیوں کے نقطہ نگاہ کے مطابق انسان کا جوہر فقط اس کی عقل ہے اور باقی سب آلے اور وسیلے اس کے طفیلی ہیں۔ اگر بدن دیا گیا ہے تو یہ عقل کے لیے ایک آلہ ہے۔ اگر آنکھیں دی گئی ہیں، کان دیے گئے ہیں، حافظہ دیا گیا ہے اور تخیل کی قوت دی گئی ہے، غرضیکہ جو قوتیں اور متعدد اعضاء ہمارے وجود میں ہیں وہ ہماری ذات کے لیے آلے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہماری ذات

منطق ہے۔

کیا ہم اسلام کے حوالے سے اس مطلب کی تائید کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس بات کی تائید اسلام سے نہیں مل سکتی کہ انسان کا جوہر فقط عقل ہے اور بس۔ بلکہ اسلام ان دوسرے نظریوں کی تائید کرتا ہے جن کے مطابق عقل انسان کا تمام وجود اور تمام ہستی نہیں اور یہ اس کے وجود کی ایک شاخ ہے۔

اب ہم دوسرے مطالب کی جانب آتے ہیں۔

عموماً ہمارے فلسفے کی کتابوں حتیٰ کہ ملا صدرا کی کتابوں میں کہ جنہوں نے ان میں کسی حد تک عارفوں کا ذوق بھی داخل کر دیا ہے یہ بات موجود ہے کہ اسلامی ایمان کی تفسیر لفظ "پہچان" سے کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے معنی "پہچاننے" کے ہیں اور بس۔ یعنی خدا پر ایمان کے معنی خدا کی پہچان کے ہیں، پیغمبر پر ایمان کے معنی پیغمبر کی پہچان کے ہیں، فرشتوں پر ایمان کے معنی فرشتوں کی پہچان کے ہیں اور روز جزا (معاد) پر ایمان کے معنی بھی معاد کی پہچان کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں ایمان کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے معنی معرفت اور پہچان کے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ تاہم یہ بات کسی بھی وجہ سے اس بات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی جو اسلام کہتا ہے۔ اسلام میں ایمان "پہچان" سے بڑھ کر ایک حقیقت ہے۔ اب آپ اس بات کی طرف توجہ فرمائیں۔

پہچاننے کا مطلب جاننا ہے۔ ایک انسان جو آب شناس ہے، پانی کو پہچانتا ہے۔ ایک وہ شخص جو ستارہ شناس ہے، وہ ستاروں کو پہچانتا ہے۔ ایک اور انسان جو جامعہ شناس ہے، وہ معاشرے کو پہچانتا ہے۔ ایک اور شخص جو

دوا شناس ہے وہ دواؤں کی خصوصیات کو جانتا ہے۔ ایک اور جنون شناس ـــــ جنون کو پہچانتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی مخصوص چیز کی حقیقت اس شخص پر واضح ہے اور وہ اسے جانتا ہے۔ کیا قرآن میں بھی ایمان کے معنی فقط پہچاننے کے ہیں؟ کیا خدا پر ایمان کے معنی فقط خدا کو سمجھنے کے ہیں۔ کیا پیغمبر پر ایمان کے معنی فقط اس کو سمجھنے کے ہیں؟ نہیں۔ قرآن میں ایمان کا مطلب یہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ "پہچان" ایمان کا رکن اور ایمان کا جزو ہے۔ ورنہ پہچان کے بغیر ایمان ممکن نہیں ہے ـــــ لیکن فقط "پہچان" ہی ایمان نہیں ہے۔ ایمان میں پہچان کے ساتھ ایمان کا عنصر ہے۔ ایمان میں میلان کا عنصر، تسلیم کا عنصر، خضوع کا عنصر اور محبت کا عنصر بھی رچا بسا ہوا ہے لیکن پہچان میں میلان کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ایک شخص کے ستارہ شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ ستاروں سے میلان بھی رکھتا ہے۔ نہیں ـــــ وہ فقط ستاروں کو پہچانتا ہے۔ ایک شخص کے معدن شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ معدنیات سے میلان بھی رکھتا ہے۔ ایک شخص کے آب شناس ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ پانی سے میلان بھی رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات انسان ایک ایسی چیز کو پہچانتا ہو جس سے وہ بے حد نفرت کرتا ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سیاست میں اکثر ایک دشمن اپنے دشمن کو اپنے آپ سے زیادہ پہچانتا ہے۔ مثلاً اسرائیل میں ممکن ہے کہ وہ شخص مسلمانوں سے زیادہ ہوں۔ جو عرب شناس اور مسلمان شناس ہوں حتیٰ کہ بعض ایک معنی میں اسلام شناس بھی ہوں۔ مسلمہ طور پر اس وقت اسرائیل میں مصر شناس، سوریہ شناس، الجزائر شناس ایران سے کہیں زیادہ موجود ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں میں ایک بھی حقیقی مصر شناس نہ ہو جب کہ دریائے نیل کے پاس سے سیکڑوں آدمی موجود ہیں لیکن اگر اسرائیل مصر کو پہچانتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس سے میلان رکھتا ہے؟ یا اگر مصر اسرائیل کو پہچانتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس سے میلان رکھتا ہے؟ اتفاقاً معاملہ اس کے برعکس ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔

مسلم علماء کہتے ہیں:

اسلام میں ایمان فقط پہچان نہیں ہے جیسا کہ فلسفی دعویٰ کرتے ہیں۔

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بہترین پہچاننے والوں کے بہترین نمونے بتلائے ہیں۔ وہ بہترین پہچاننے والوں کا تعارف یہ کراتا ہے کہ وہ خدا کو اونچے درجے تک پہچانتے ہیں، معاد کو اونچے درجے تک پہچانتے ہیں اور اس کے باوجود وہ کافر ہیں — مومن نہیں ہیں۔ وہ کون ہیں؟ وہ شیطان ہے۔

کیا شیطان خدا کو جانتا ہے یا اس شخص کو جو خدا پرست اور خدا کا دشمن ہے؟

ہاں — شیطان ہمارے اور آپ کے مقابلے میں خدا کو بہت زیادہ پہچانتا ہے۔ اس نے چھ ہزار سال خدا کی عبادت کی ہے۔ کیا شیطان فرشتوں کو پہچانتا ہے یا نہیں پہچانتا؟ انہیں فرشتوں کو جن پر ایمان لانے کا حکم ہمیں قرآن نے دیا ہے۔ جی ہاں — وہ ہزاروں سال فرشتوں کی صف میں رہا ہے اور وہ ایک ہی درجے میں عمل کرتے رہے ہیں۔ وہ جبرئیل کو مجھ سے اور آپ سے بہت اچھے طور پر پہچانتا ہے۔ پیغمبروں کا معاملہ کیسا ہے؟ کیا وہ پیغمبروں کو پہچانتا اور جانتا ہے کہ یہ پیغمبر ہیں یا ایسا نہیں ہے؟ جی ہاں، وہ سب پیغمبروں کو پہچانتا ہے اور ہم سے بھی بہتر پہچانتا ہے۔

معاد کا معاملہ کیسا ہے؟ جہاں تک معاد کا تعلق ہے وہ خود ہمیشہ خدا سے کہتا ہے، اسے ذہن میں تصور کرتا ہے یوں وہ معاد کو بھی مکمل طور پر پہچانتا ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود قرآن شیطان کو کیوں کافر قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

مگر ابلیس نے جو شیخی میں آگیا سجدہ نہ کیا، اور کافروں میں ہو گیا۔ (سورہ ص۔ آیت ۷۴)

جب یہ فلسفی کہتے ہیں کہ ایمان فقط پہچان ہے تو شیطان کو بھی مومن ہونا چاہیے لیکن وہ مومن نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسا پہچاننے والا ہے جو جانتا ہے اور پہچانتا ہے لیکن اس کے باوجود حق سے دشمنی رکھتا اور مخالفت کرتا ہے۔ وہ جس حقیقت کو پہچانتا ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا، اس کے بارے کوئی میلان اور لگاؤ نہیں رکھتا اور اس حقیقت کی جانب حرکت نہیں کرتا — پس ایمان فقط پہچان نہیں ہے۔

بےشک ہم نے انسان کو بہت اچھے انداز سے پیدا کیا۔ پھر رفتہ رفتہ پست ترین حالت کی طرف پھیر دیا۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے۔ (سورہ تین۔ آیت ۶)

ہمارے بعض حکماء اس آیت مبارکہ کے بارے میں "مگر وہ لوگ جو ایمان لائے" کہتے ہیں کہ یہ حکمت عملی ہے — تاہم ایسا نہیں ہے کیونکہ "وہ لوگ جو ایمان لائے" اس میں ایک ایسی چیز ہے جو حکمت نظری سے مربوط ہے اور حکمت عملی اس کا ایک پایہ ہے اور یہ پوری حکمت، عرفان، علم اور معرفت نہیں ہے۔ اس میں پہچان سے ماوراء ایک چیز وجود رکھتی ہے جو تسلیم اور [illegible] ہے۔

پس یہاں تک ہم نے عقلیت پسندوں کے مکتب کے تین مسئلے بیان کیے ہیں:

(۱) عقل حجت ہے، جو چیزیں وہ دریافت کرتی ہے وہ قابل اعتماد ہیں اور وہ صحیح معرفت حاصل کر سکتی ہے (اسلام بھی اس کی تائید کرتا ہے)

(۲) عقل آدمی کا اصل جوہر ہے اور اسلام اس کی تائید نہیں کرتا۔

(۳) یہ دعویٰ کہ اسلامی ایمان بس عقل کی دریافت، معرفت اور پہچان ہے ـــ اس کے سوا وہ کوئی چیز نہیں، اس کے متعلق بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام اس کی نفی کرتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ایمان اصالت رکھتا ہے، یا ایمان عمل کی تمہید ہے اور کوئی اصالت نہیں رکھتا۔ یہاں ہم اس بات سے قطع نظر کرتے ہیں کہ آیا ایمان کو فقط معرفت سمجھیں یا معرفت کو ایمان کا ایک جزو گردانیں؟ کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ معرفت ـــ ایمان کا جزو ہے۔ ایمان کوئی اصالت رکھتا ہے یا نہیں رکھتا؟ یہاں پھر دو عظیم مکاتب ایک دوسرے کے مقابلے پر صف آرا ہوتے ہیں۔

یہ جو ہم کہہ رہے ہیں کہ ایمان اصالت رکھتا ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟ کیا یہ اس نقطۂ نگاہ سے ہے کہ ایمان انسان کے عمل کی اعتقادی بنیاد ہے؟ یعنی اس لحاظ سے کہ دنیا میں انسان کو چاہیے کہ کوشش کرے، سرگرم ہو، جد و جہد کرے اور ہمیشہ مصروف عمل رہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ سرگرمی کسی نقشے کی بنیاد پر ہو، اس کا کوئی مقصد ہو، اس میں کوئی ترتیب ہو اور کوئی اعتقادی بنیاد بھی ہو چونکہ انسان بہرحال ایک موجود ہے اور اس کی فعالیت فطری ہے، اس لیے اگر وہ چاہے کہ اس کی زندگی کا ایک لائحۂ عمل ہو، اور یہ بھی چاہے کہ وہ زندگی میں اپنا مقصد پا سکے تو یہ ایک فکری اور اعتقادی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

پس ضروری ہے کہ ایک فکری اور اعتقادی بنیاد مہیا کی جائے تاکہ وہ اس پر اپنے فکری نظام کی بنیاد رکھ سکے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص ایک عمارت، ایک مکان یا ایک ہال بنانا چاہتا ہو۔ ہال بنانے والے کا مقصد یہی ہے کہ اس کی چار دیواری ہو، چھت ہو اور دروازے ہوں۔ لیکن جو کام زمین کھود کر بنیادوں میں کیا جاتا ہے اور پھر اس پر دیواریں اٹھائی جاتی ہیں اگرچہ وہ ہال بنانے والے کا ہدف اور مقصد نہیں۔ لیکن اس غرض سے کہ عمارت کھڑی رہے، تاکہ وہ نہ گرے تو پھر ضروری ہے کہ بنیاد اس طرح تیار کی جائے کہ وہ عمارت مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

آجکل کے اجتماعی مکاتب ـــ مثلاً کمیونزم میں فکری اور اعتقادی اصول موجود ہیں جن کی بنیاد مادیت MATERIALISM پر ہے اور وہ مادیت پر مبنی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اصولوں کا ایک ضابطہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک فکری نظام کے نقطۂ نظر سے وہ اصول، اعتقادی لحاظ سے اس کی فکری بنیادیں ہیں۔ مگر وہ فکری اصول اس کا ہدف نہیں ہیں۔ درحقیقت مادیت ایک کمیونسٹ کا ہدف نہیں ہے اور وہ اس کے لیے کوئی اصالت نہیں رکھتی۔

بنیادی طور پر وہ لوگ بھی جو مادیت کی گود میں جا گرے ہیں۔ اس کی وجہ وہ احمقانہ مخالفتیں ہیں جو ایک کلیسا نے ان سیاسی، اجتماعی اور خصوصاً آزادی پسندانہ خیالات کے بارے میں کیں۔ اس مذہبی حماقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی دنیا میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ انسان کو چاہیے کہ یا تو وہ خدا کو چھوڑ کر معاشرے میں آزاد اور حقدار بن کر رہے اور اپنے آپ کو حقدار سمجھے یا خدا پر اعتقاد رکھے ـــ اپنے آپ کو حقدار نہ سمجھے اور اپنے آپ کو آزاد نہ جانے۔ بعد میں آزادی

کی اس منزل کے لیے ایک راستہ تیار کرنے کی خاطر سب سے پہلے مذہب کی بنیاد پر ضرب لگائی گئی۔ ایک کمیونسٹ کے لیے مادیت واقعی کوئی اصالت نہیں رکھتی لیکن وہ سوچتا ہے (اور اس کی یہ سوچ بھی غلط ہے) کہ مادیت کے بغیر ان اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی اصولوں کی کسی طور پر توجیہ نہیں ہو سکتی۔ پس ان کی توجیہ کرنے کے لیے ہم مادیت کے فکری اصولوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

آج کی دنیا میں بہت سے ایسے کمیونسٹ پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے تجزیہ کیا اور کہا کہ مادیت ہمارے لیے کوئی اصالت نہیں رکھتی اور ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف کمیونزم چاہتے ہیں خواہ وہ مادیت کے بغیر ہی کیوں نہ ہو۔ کیا کئی ایک کمیونسٹ ایسے نہیں ہیں جو مذہب کی مخالفت میں رفتہ رفتہ کمی کر رہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادیت کے فکری اصولوں پر ان کا ایمان کوئی اصالت نہیں رکھتا اور وہ اصول فقط ان کی سوچ کی اعتقادی اور فکری بنیادیں ہیں۔ چونکہ کوئی نظریہ [illegible] جہان بینی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اس لیے وہ اس جہان بینی کو اس عمارت کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور اس نظریے کے سارے جزئیات [illegible] ذہنی [illegible] کریں لیکن اس نظریے کے تمام جزئیات کی بنیاد اور صرف جہان بینی ہی ہے۔

اسلام میں کیا صورت ہے؟ اسلام میں ایمان —— جو خود ایک جہان بینی پر مشتمل ہے، یہ ایمان انبیاء و اولیاء پر ایمان اور معاد پر ایمان ہے۔ کیا اس نے یہ چیزیں فقط اس لیے پیش کی ہیں کہ ان کے ذریعے ایک فکری اور اعتقادی بنیاد فراہم کرے کہ وہ اپنے اس نظریے (IDEOLOGY) کو (جو عملی مذہب ہی ہے) ایک عمارت کی صورت میں استوار کر سکتا ہے اور اس لیے یہ فکری اصول اس نے دیے ہیں کہ وہ [illegible]

کہ یہ اصول خود اصالت رکھتے ہیں کیونکہ اسلام کے نظریے کی فکری اور اعتقادی بنیاد میں ایمان کی حیثیت صرف بنیاد میں ڈالے گئے مواد کی نہیں ہے بلکہ صورت یہ ہے کہ اگر ایک عمارت کو منہدم کر دیا جائے تو یہ ایک لغو عمل شمار ہوتا ہے۔

اسلام میں —— باوجودیکہ اسلامی ایمان فکری اور اعتقادی بنیاد ہے اور اسلامی نظریہ اسی بنیاد پر استوار ہوا ہے، وہ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی اصالت رکھتا ہے یعنی اس بارے میں فلسفی حق یہ ہے کہ ایمان خود اصالت رکھتا ہے اور اس کی حیثیت فقط عمل کے لیے ایک تمہید کی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے عمل ہے، جو کچھ ہے تعبدیت ہے اور جو کچھ ہے [illegible] ہے بلکہ اگر ایمان کو عمل سے الگ کر لیں تو کیا کچھ ہو سکتا ہے؟ نہیں، اگر ہم ایمان کو عمل سے الگ لیں تو ہم نے ایک ستون گرا دیا اور اسی طرح اگر عمل کو ایمان سے الگ لیں تو بھی ہم نے ایک ستون گرا دیا۔

قرآن ہمیشہ فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے۔"

یعنی عمل کو تنہا کر کے ایمان ایک عمارت کا ایک رکن ہے اور اس کا دوسرا رکن عمل ہے۔

بے شک عمارت کا صرف ایک ستون پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ایمان ذاتی قیمت اور اصالت رکھتا ہے اور درحقیقت اس دنیا میں اور بالخصوص دوسری دنیا میں انسان کا کمال یہی ہے کہ وہ ایمان رکھتا ہو کیونکہ [illegible] واقعی ایک مستقل جزو ہے اور اس کا اپنا کمال ہے بطور انسان

سے موت کے بعد باقی رہتی ہے اور اگر وہ اپنے کمالات تک نہ پہنچے تو ناقص اور فاسد ہے اور خوش بختی حاصل نہیں کر سکتی۔

آپ قرآن مجید کو دیکھیں کہ وہ ان موضوعات پر کیا فرماتا ہے:

۱؎ اور جو شخص اس دنیا میں (عقل کا) اندھا بنا رہا وہ آخرت میں اندھا اور راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا۔

(سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۲)

صاف ظاہر ہے اس آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دنیا میں جس شخص کی ظاہری آنکھیں اندھی رہیں گی وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ابوبصیر جو امام صادقؑ کے اصحاب میں تھے اور ان کی ظاہری آنکھیں نابینا تھیں، کیا دوسری دنیا میں ان کی حالت خراب ہوگی؟ نہیں ——— بلکہ اس دنیا میں جس شخص کی باطنی آنکھیں حقائق دیکھنے کو اور اس چیز کا ادراک کرنے سے جس پر اسے ایمان رکھنا چاہیئے یعنی اپنے خدا اور اس کی نشانیوں کو دیکھنے سے، اندھی ہوں گی وہ اس دنیا میں اندھا اٹھایا جائے گا اور اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ ایک شخص اس دنیا میں ایمان نہیں رکھتا ——— تاہم اگر اس دنیا کے تمام اچھے کام انجام دیے ہوں، وہ تمام اچھی کوششیں کی ہوں جو انسان کرتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں تمام امر بالمعروف انجام دیے ہوں، تمام نہی عن المنکر پر عملدرآمد کیا ہو، اس نے دنیا میں عظیم ترین پرہیزگاروں جیسی زندگی گزاری ہو اور اس نے اپنی زندگی خلق خدا کے لیے وقف کردی ہو لیکن اگر وہ خدا کو نہ پہچانتا ہو، عالم ہستی کو نہ پہچانتا ہو اور

معاد و قیامت کو نہ پہچانتا ہو تو وہ اندھا ہے اور بلاشبہ اس دنیا میں بھی اندھا ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایمان اعمال کی تمہید ہے اور جس شخص کے اعمال اچھے ہیں اگر اس کا ایمان درست نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں ——— یہ بات نہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ایمان بھی رکھتا ہو۔

۲؎ وہ کہے گا الٰہی! میں تو آنکھوں والا تھا، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔ خدا فرمائے گا اسی طرح کہ ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، تو نے انہیں بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا جائے گا۔ (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۱۲۵۔۱۲۶)

قیامت کے دن ایک بندہ اندھا اٹھایا جاتا ہے اور وہ اعتراض کرتا ہے کہ اے خدا! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ میں جو دنیا میں آنکھیں رکھتا تھا یہاں اندھا کیوں ہوں؟

جواب ملتا ہے کہ تو دنیا میں جو آنکھیں رکھتا تھا وہ یہاں کام نہیں آتیں۔ یہاں دوسری آنکھوں کی ضرورت ہے۔ وہ معنوی اور باطنی آنکھیں ہیں جنہیں تم نے دنیا میں اندھا کر لیا تھا اور آج یہاں بھی اندھے ہو۔ اس دنیا میں ہماری نشانیاں موجود تھیں لیکن تو نے بجائے اس کے کہ ہماری نشانیوں کو دیکھتا، انہیں پہچانتا، حقیقت کو سمجھتا اور عالم حقیقت میں حقیقی بصیرت کے ساتھ آتا ——— تو نے اس دنیا میں حقیقت کو نہ سمجھا اور وہاں اپنے آپ کو اندھا کر لیا تھا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن یہ بھی کہتا ہے:

۳؎ بے شک یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار کی رحمت سے

الگ تھلگ کر دیے جائیں گے۔ (سورۂ تطفیف، آیت ۱۵)

یہ ان لوگوں کا حال ہے جو اس دنیا میں حق و حقیقت کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے اور ایمان و یقین کی منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔

یہاں کے معنی یہ ہیں کہ اے انسان۔ تو اس دنیا میں آیا ہے تاکہ تیری آنکھ اس دنیا میں اس دنیا کو دیکھے اور تیرے کان اس دنیا میں اس دنیا کی آواز سنے۔

میں نے کئی بار کہا ہے کہ میں خوش نصیب ہوں جو دیکھتا ہوں کہ ہمارے جوان نہج البلاغہ کی جانب توجہ رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کو چاہیے کہ نہج البلاغہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھیں۔ آپ دیکھیں کہ نہج البلاغہ اس قسم کے ناشنوا کانوں سے کیا بات کہتی ہے۔ کیونکہ نہج البلاغہ ایمان کی صداقت کی قائل ہے۔ نہج البلاغہ یہ نہیں کہتی کہ ایمان کی حیثیت صرف فکری اور اعتقادی مسائل کی سی ہے بلکہ یہ بھی کہنا چاہتی ہے کہ یہ بنیاد نہیں ہے بلکہ بنیادی اور اعتقادی حیثیت کے ساتھ ساتھ یہ ذاتی قیمت بھی رکھتا ہے۔

امام علی علیہ السلام اہل اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وہ اسے پکارنے کی وجہ سے علم و بخشش کی ہواؤں میں سانس لیتے ہیں۔" (نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۰۹ صفحہ ۶۰۸)

یہ وہ لوگ ہیں جو اس حالت میں خدا کو پکارتے ہیں، استغفار کرتے ہیں اور استغفار میں محو ہو جاتے ہیں تو اچانک اپنے اندر بخشش کی ٹھنڈی ہوا محسوس کرتے ہیں۔

امام علیؑ مزید فرماتے ہیں:

"بے شک اللہ سبحانہ نے اپنی یاد کو دلوں کا صیقل قرار دیا ہے جس کے باعث وہ (امر و نہی سے) بہرے ہونے کے بعد سننے لگتے ہیں اور اندھے ہونے کے بعد دیکھنے لگتے ہیں اور دشمنی و عناد کے بعد فرمانبردار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے ہر عہد و زمانہ سے خالی دور میں رب العزت کے کچھ مخصوص بندے ہمیشہ مخصوص رہتے ہیں کہ جن کی فکروں میں وہ سرگوشیوں کی صورت میں (حقائق و معارف کا) القاء کرتا ہے اور ان کی عقلوں سے الہامی آوازوں کے ساتھ کلام کرتا ہے۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۰۹، صفحہ ۲۰۶)

یعنی وہ ہر دور میں وجود رکھتے ہیں اور کوئی دور ایسا نہیں جس میں وہ موجود نہ ہوں۔ امام علیؑ کے ارشاد کے مطابق وہ ہمارے دور میں بھی وجود رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر اور اپنی سوچ کے اندر اپنے خدا کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ مولانا رومی کی ایک بڑی پُرکشش اور عمدہ مثال ہے:

ترسم بروم عالم جان نادیدہ
بیرون روم از جہان، جہان نادیدہ
در عالم جان چون روم از عالم تن؟
در عالم تن عالم جان نادیدہ

وہ کہتا ہے:

مجھے ڈر ہے کہ میں مر جاؤں گا لیکن میرے دل کی آنکھ کھلی نہ ہوگی میں دنیا

کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا لیکن حقیقت میں اس کو دیکھا ہی نہ ہوگا۔

اس سے رازی کی مراد یہ نہیں کہ اس نے درخت زمین اور دیواروں کو نہیں دیکھا یا سمندر اور ستاروں کو نہیں دیکھا، نہیں — دنیا سے اس کی مراد دنیا کی روح اور دنیا کا مبدا ہے کہ اسلام جسے "باطن" سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تن کی دنیا میں روح کی دنیا کو نہیں دیکھا، پھر جب میں تن کی دنیا سے روح کی دنیا میں جاؤں گا تو اسے وہاں کیسے دیکھ سکوں گا؟ مجھے چاہیے تھا کہ اسے یہیں دیکھ لیتا لیکن نہیں دیکھ سکا۔

اور جو شخص اس دنیا میں (عقل کا) اندھا بنا رہا وہ آخرت میں اندھا اور راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا۔ (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۲)

رازی کی جو رباعی اوپر درج ہوئی ہے وہ اسی آیت کی تشریح کر رہا ہے۔ اس آیت کا تعلق ایمان اور معرفت سے ہے۔ یعنی خدا کی معرفت، خدا کے فرشتوں کی معرفت جو عالم وجود کے واسطے ہیں، خدا کے نبیوں اور دنیا کی معرفت جو ہماری جانب ایک دروازہ ہیں خدا کے فیض کا واسطہ ہیں اور اس بات کی معرفت کہ ہم اس دنیا میں آئے ہیں تو کیوں آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ اس بات کی معرفت کہ ہمیں بالآخر اور بہرحال (معاد و قیامت میں) خدا کی جانب لوٹنا ہے اور یہ کہ ہر چیز کو خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ ساری معرفتیں بجائے خود اصالت رکھتی ہیں اور ان حقائق پر ایمان بھی ایک اصالت رکھتا ہے لیکن خود اصالت رکھنے کے ساتھ یہ اسلام کے فکری اور اعتقادی نظریے کی بنیاد بھی ہے اور ایک اصل ایمان کسی نظریے IDEOLOGY کے لیے ایک بہت اچھی فکری اور اعتقادی بنیاد بن سکتا ہے۔ پس کبھی عمل کو ایمان پر

قربان کرو اور ایمان کو بھی عمل پر قربان نہ کرو، گویا ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔

اب مجموعی طور پر فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان — درحقیقت "کامل انسان" نہیں ہے بلکہ ایک ناقص انسان ہے یعنی وہ اپنے اندر کمال کا صرف ایک حصہ رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو عقل کمال کی اصالت کے قائل ہیں، اگرچہ ان کی یہ بات صحیح ہے لیکن انہوں نے انسانی کمالات کے دوسرے پہلوؤں کو نظرانداز کر کے انسان کے تمام کمالات کو اس کے عقل کی طرف لوٹا دیا ہے۔ اسی بنا پر فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان "روح کامل" ہے۔ فلسفیوں کا مجوزہ کامل انسان فقط دانائی کا ایک مجسمہ ہے جو فقط علم ہستی کو جانتا ہے یعنی جو کامل انسان انہوں نے فرض کیا ہے وہ ایک ایسا وجود ہے جو مکمل طور پر خوب جانتا ہے۔ لیکن شوق، حرکت، حرارت اور عشق کے باطن سے یکسر خالی ہے کیونکہ وہ فقط جانتا ہے اور بس۔ یعنی وہ ایک ایسا وجود ہے جس کا تمام تر کمال یہ ہے کہ وہ خوب جانتا ہے اور وہ بہت خوب جانتا ہے۔ اس کا یہ جاننا — اس کائنات کو اپنی ذہنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ درحقیقت اس کے وہ ایک وسیع دنیا ہے جو ایک گوشے میں سمٹ گئی ہو تاہم یہ اسلام کا بتایا ہوا کامل انسان نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی رو سے ایک نیم کامل انسان ہے۔

عقل کی قدر و قیمت اور فلسفیوں کی جانب سے عقل کی تائید کہ جو درست ہے، پیش اس کی تائید میں حضرت موسیٰ کاظم ؑ کی روایت نہیں بیان کر سکا، لیکن اس موضوع کے تحت بہت زیادہ مطالب ہیں اور اگر ہم اس

اس بارے میں گفتگو کرنا چاہیں تو اس کے لیے مزید ایک یا دو راتیں درکار ہوں گی۔
بہرطور آج رات میں اپنی تقریر یہیں ختم کرتا ہوں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِہِ الطَّاھِرِیْن

ساتویں نشست

کامل انسان اور مختلف نظریات (۲)

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا، اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(سورۂ جمعہ - آیت ۲)

اس مقدس جلسے میں جو بحث کی جانے والی ہے، یہ اس گفتگو کے تسلسل میں ہے جو چند یوم قبل مسجد جاوید میں کی گئی تھی۔ تاہم مجھے یہ علم نہیں کہ کتنے معزز حاضرین نے ان جلسوں میں شرکت کی اور کتنے شریک نہیں ہوئے۔ لہٰذا ہم یہ بحث اس انداز میں کریں گے کہ جو حضرات ان جلسوں میں شریک نہیں ہوئے وہ بھی اس کا مطلب سمجھ لیں۔ وہاں ایک رات ہم نے مختصر طور پر کامل انسان کے متعلق مختلف مکاتب کے نظریات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا

کہ فلسفیوں کے نقطۂ نظر کے مطابق "کامل انسان" ایک طرح کا ہے۔ قدما کے
خیال میں ایک اور طرح کا اور بہت سے جدید فلسفیوں کے نظریے کے مطابق ایک
اور طرح کا ہے۔ اس وقت ہم نے مختلف مکاتب کا اجمالی طور پر تعارف کرایا تھا اور
ان کے بارے میں تفصیلی بحث ہم بعد میں کریں گے۔ مکتب عقل، مکتب عشق، مکتب
محبت، مکتب قدرت اور مکتب خدمت وغیرہ کے بارے میں ہم نے جب ذکر
شروع کیا تھا۔ آج رات ہم ان مکاتب میں سے ایک مکتب کے متعلق تفصیل کے
ساتھ گفتگو کریں گے اور اس مکتب کے مختلف حصوں کے بارے میں اسلام کا
نقطۂ نظر بیان کریں گے۔

پچھلی نشست میں ہماری بحث مکتب عقل یعنی عقلیت پسندوں سے
مخصوص تھی لیکن آج کی نشست میں ہماری بحث کامل انسان کے متعلق مکتب
عرفان و تصوف کے نقطۂ نظر کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا تھا کہ
عرفان و تصوف کے نقطۂ نظر کے مطابق کامل انسان کے بارے میں بحث بہت
ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ کامل انسان کے متعلق ارسطو اور ابن سینا وغیرہ
جیسے فلسفیوں نے جو کچھ بیان کیا وہ لوگوں میں مقبولیت نہیں پا سکا کیونکہ وہ
محض ان فلسفیوں کا ایک قول تھا جو فلسفے کی کتابوں کے متن میں آیا اور پھر
وہاں سے باہر نہیں نکلا لیکن مکتب عرفان و تصوف نے کامل انسان کے متعلق
اپنا نقطۂ نظر لوگوں کے درمیان نظم و نثر دونوں ذریعوں سے پھیلایا ہے۔ عرفان و
تصوف کی کتابیں خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہوں وہ ان مطالب کو تمثیل
اور شعر کی زبان میں بیان کرتی ہیں۔ فلسفیوں کے مکتب کی طرح یہ مکتب بھی
کچھ ایسے قابل قبول مطالب اور مسائل کا حامل ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر کے

مطابق قابل قبول ہیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ مقصد و تحقیق سے معرا نہیں ہیں اور
وہ مطلوب کامل انسان ۔۔۔ اہل عرفان و تصوف کے مجوزہ کامل انسان سے
مطابقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ فلسفی تنہا عقل کو ہی
انسان کی ذات اور جوہر سمجھتے ہیں اور جو چیزیں عقل کے علاوہ ہیں وہ انسان
کی ذات سے خارج ہیں اور اس کے لیے صرف وسیلوں اور آلوں کا حکم رکھتی
ہیں۔ انسان کی "من" انسان کی سوچنے کی قوت یعنی انسان کی منطقی سوچ بچار
عرفا، انسان کی عقل اور انسان کی فکر کو اس کی اصل ذات نہیں سمجھتے بلکہ
وہ عقل اور فکر کو انسان کے لیے ایک آلہ خیال کرتے ہیں۔ وہ ہر شخص کی حقیقی
من اور ذات اس چیز کو سمجھتے ہیں جسے وہ "دل" کہتے ہیں۔ حکیم اور فلسفی
اس کو وہ چیز سمجھتا ہے جسے وہ عقل سے تعبیر کرتا ہے اور عارف انسان کی
واقعی من اس چیز کو سمجھتا ہے جسے وہ دل سے تعبیر کرتا ہے۔ البتہ اس میں
کوئی شک نہیں کہ ایک عارف جس چیز کو دل کہتا ہے اس سے مراد گوشت کا وہ
لوتھڑا نہیں جو انسان کی بائیں جانب ہوتا ہے بلکہ دل سے مراد انسان میں
احساس، جوش اور غور و فکر کا مرکز ہے

عارف عشق اور احساس کو بہت اہمیت دیتا ہے جو نفسانی احساسات
میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ البتہ جس عشق کا عارف ذکر کرتا ہے وہ جانے
پہچانے عشق و محبت سے مختلف چیز ہے۔ جبکہ ہمارا عشق عام طور پر جنسی پہلو رکھتا
ہے لیکن یہ عارف کا عشق وہ عشق ہے جو پہلے خدا تک بلند ہوتا ہے کیونکہ عارف
کا حقیقی معشوق خدا ہے۔ علاوہ ازیں جس عشق کا عارف ذکر کرتا ہے وہ صرف
عارف تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عارف کا عقیدہ یہ ہے کہ عشق تمام موجودات عالم

میں رچا بسا ہوا ہے۔ عرفانی کتابوں اور بعض فلسفیانہ کتابوں ـــــ مثلاً اسفار میں کہ جس کا جھکاؤ عرفان کی طرف ہے "فی سریان العشق فی جمیع الموجودات" کے تحت ایک مستقل باب نظر آتا ہے۔ یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ عشق ایک ایسی حقیقت ہے جو وجود کے تمام ذرات میں جاری و ساری ہے۔ اس بنا پر بھی عشق ہے اور اس کے علاوہ آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ مجازی مجاز ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں مولوی معنوی نے کہا ہے:

عشق بحری است آسمان بروی کفی
چون زلیخا در ہوای یوسفی

عشق ایک سمندر ہے اور یہ زمین و آسمان سمندر کے جھاگ کی طرح ہے جو پانی سے اس طرح محبت رکھتا ہے جس طرح زلیخا کو یوسف سے محبت تھی۔

(مثنوی مولانا روم، صفحہ ۵۲۰)

حافظ شیرازی کہتے ہیں:

ما بدین در نہ پی حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم
رہرو منزل عشقیم ز سرحد عدم
تا بہ اقلیم وجود این ہمہ راہ آمدہ ایم

ہم اس در پر دولت اور شان حاصل کرنے نہیں آئے ہیں
تو ایک حادثے کے باعث یہاں پناہ لینے آنا پڑا۔
اصل میں ہم راہ عشق کے مسافر ہیں اور اس کی خاطر ہی عدم
سے وجود کے مرحلے تک پہنچے ہیں۔

یہ اشعار کتنے بلند پایہ ہیں ـــــ حافظ کے یہ اشعار صحیفۂ سجادیہ کے ایک جملے کا ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ حمد و ثنا کے بعد امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

یعنی خدا نے موجودات کو عدم سے پیدا کیا اور بہ طرز ابداع (ابداع کے معنی یہ ہیں کہ اس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ تھا۔) بعد میں اس نے ان موجودات کو اپنی محبت کی راہ پر ڈالا۔ (صحیفۂ سجادیہ۔ دعا۔ اول)

جیسا کہ حافظ شیرازی نے درج بالا رباعی میں کہا ہے کہ اصل میں ہم راہ عشق کے مسافر ہیں اور اس کی خاطر ہی عدم سے وجود کے مرحلے تک پہنچے ہیں۔

جب عرفاء یہ کہتے ہیں کہ انسان میں اور تمام دنیا میں ایک سے زیادہ حقیقت کا وجود نہیں ہے اور وہ ایک حقیقت عشق ہے تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کی حقیقت کیا ہے؟ ایک عارف کسی فلسفی کی مانند یہ نہیں کہتا کہ انسان کی حقیقت "فکر" ہے بلکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کا دل ہے اور دل وہی چیز ہے جو عشق ہی کا مرکز ہے۔ پس یہاں عارف و فلسفی میں ایک تفاوت ہے اور وہ یہ کہ عرفان میں "من" وہ چیز ہے جو "عشق" کرتی ہے نہ وہ جو "فکر" کرتی ہے۔

جب انسان ـــــ کامل انسان کے مقام پر پہنچنا چاہتا ہے تو فلسفی کے نقطۂ نظر کے مطابق اسے کن ذرائع کے ساتھ جانا چاہیے؟ وہ کہتا ہے منطق کے ساتھ، منطق کے پاؤں کے ساتھ، استدلال کے سہارے کے ساتھ، قیاس کے مقدمات کے ساتھ، صغری اور کبری کی ترتیب دیتے ہوئے سوچتے ہوئے اور ان مقدمات کے نتیجے تک پہنچنے کے ساتھ انسان ـــــ "کامل انسان" کے مرتبے تک جا پہنچتا

جب کہ عارف کا نظریہ کچھ اور ہے:

در سر عارف سواد و حرف نیست
جز دل اسپید ہمچوں برف نیست

عارف کے تصور میں دو حرف (توحید و نبوت) کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور اس کا دل شک و شبہ سے پاک ہوتا ہے۔

عارف ـــــ حرف، سواد، مقدمہ، صغریٰ، کبریٰ، استدلال و نتیجے وغیرہ کی بات نہیں کرتا اور ان سب باتوں کی بجائے کہتا ہے:

تصفیۂ نفس اور اصلاحِ نفس کرو۔ برے اخلاق کو اپنے آپ سے دور کرو اور جہاں تک ممکن ہو غیرِ حق کی جانب سے اپنی توجہ ہٹاؤ نیز اپنے خیالات پر زیادہ سے زیادہ قابو پاؤ۔ تمہارے دل میں خدا کے علاوہ جو کسی دوسرے کا خیال آتا ہے وہ دیو (شیطان) ہے۔ پس جب تک دیو وہاں موجود ہے، فرشتہ جو خدا کا نور ہے وہ تیرے دل میں ہرگز نہیں آئے گا۔

حافظ شیرازی کہتے ہیں:

بر سر آنم کہ گر ز دست بر آید
دست بہ کاری زنم کہ غصہ سر آید
خلوت دل نیست جای صحبت اضداد
دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید

صحبت حکام ظلمت شب یلداست
نور ز خورشید جوی گو کہ در آید

بر در ارباب بی مروت دنیا
چند نشینی کہ خواجہ کی بدر آید
ترک گدائی مکن کہ گنج بیابی
از نظر رہروی کہ در نظر آید

میں اس بات پر آمادہ ہوں کہ ہاتھوں کو کام میں لگاؤں تار غم غلط ہو جائے۔

دل میں دو مخالف جمع نہیں ہوتے اور جب شیطان وہاں سے نکلتا ہے تو پھر فرشتہ آتا ہے۔

اہلِ عقل کی صحبت اندھیری رات کی طرح ہے۔ تم سورج سے روشنی حاصل کرو کہ جو تمہارے اندر آئے گی۔

دنیا کے بے مروت امرا کے دروازے پر کب تک بیٹھے دیکھتے رہو گے کہ صاحب کب باہر آتے ہیں۔

جو صاحبِ نظر سالک ہے اس سے طلبِ فیض ترک نہ کرو تاکہ تمہیں معرفت کا خزانہ مل جائے۔

ایک انسان کے ـــــ کامل انسان ـــــ کے مقام پر پہنچنے کے لیے:
مناسب جو وسیلہ بتاتا ہے، وہ اصلاحِ نفس، تصفیۂ نفس اور خدا کی جانب توجہ ہے۔ انسان خدا کی طرف جتنی زیادہ توجہ کرے، غیرِ خدا کی جانب توجہ کو جتنا زیادہ اپنے ذہن سے دور کرے، جتنا زیادہ اپنے آپ کے اندر ڈوب جائے اور باہر سے جتنا زیادہ اپنا رابطہ منقطع کرے، وہ اتنا ہی بہتر طور پر کامل انسان کے بلند مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارف قوت، بحث اور استدلال

کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔

مولوی معنوی نے کہا ہے:

پای استدلالیان چوبیں بود
پای چوبیں سخت بی تمکین بود

اہل منطق کا پاؤں لکڑی کا ہے اور لکڑی کا پاؤں بہت ہی ناپائیدار ہوتا ہے۔ (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۵۰)

وہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

بحث عقلی گر در و مرجان بود
آں دگر باشد کہ بحث جان بود
بحث جان اندر مقامی دیگر است
بادۂ جان را قوامی دیگر است

عقل و منطق کی بحث اگر موتی اور مونگے کی طرح چمک رکھتی ہو تو بھی روحانی بحث اس سے جدا چیز ہے۔
روح کی بحث کا مقام اور ہے اور اس کی ترکیب کسی اور جوہر سے ہوئی ہے۔ (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۱۴۱)

اس راستے کی انتہا کیا ہے؟

فلسفی کے راستے کی انتہا یہ تھی کہ اس نے کہا: انسان ایک "دنیا" بن جائے لیکن وہ عقل و فکر کی دنیا ہو۔ جیسا کہ فلسفی نے کہا:

۸؎ انسان کے کمال کی انتہا یہ ہے کہ تمام دنیا کا نقش خود وہ سب کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کی عقل کے آئینے میں پڑ جائے یعنی

وہ دنیا کو اپنے اندر دیکھتا ہے۔

فلسفی کے راستے کی انتہا دانائی اور دنیا کو دیکھنا تھا۔ عارف کے راستے کی انتہا کیا ہے؟

عارف کا کام راستے کی انتہا تک پہنچنا ہے نہ کہ دیکھنا — کہاں پہنچنا؟ حق تک اور ذات حق تک پہنچنا۔ عرفا کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنے باطن کی نشاندہی کرے، عشق کی سواری کے ساتھ حرکت کرے اور راستے کی منزلیں ایک کامل تر انسان کی زیر نگرانی طے کرے تو اس راستے کی انتہا یہ ہے کہ اس کے اور خدا کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور خود ان کی تعبیر کے مطابق وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن میں "لقاء اللہ" کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے لیکن عارف یہ نہیں کہتا کہ میں ایسے مقام پر پہنچ جاؤں کہ جہاں "فکر" کی ایک دنیا بن جاؤں اور وہ آئینہ بن جاؤں کہ سب کی دنیا مجھ میں منعکس ہو جائے۔ اس کی بجائے وہ کہتا ہے میں جا رہا ہوں تاکہ دنیا کے مرکز تک پہنچ جاؤں۔

۹؎ اے انسان! تو اپنے پروردگار کی حضوری کی کوشش کرتا ہے۔ پس تو اس کے سامنے حاضر ہو گا۔
(سورۂ انشقاق۔ آیت ۶)

جب تو ادھر کو چلے اور وہاں پہنچ جائے تو گویا تو نے ہر چیز کو پا لیا۔

۱۰؎ اللہ کی بندگی ایک جوہر ہے جس کی انتہا آقائی یعنی قدرت و توانائی ہے۔

جب تو وہاں پہنچ گیا تو ہر چیز پا گیا لیکن تو کوئی چیز نہیں جانتا

معلوم ہے کہ تو یک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں ہر چیز تجھے دی جاتی ہے لیکن تو اس (دوست حق) کے سوا کسی چیز کی جانب توجہ نہیں دیتا۔

ابوسعید ابوالخیر نے کیا خوب کہا ہے:

ہر کس کہ ترا شناخت جان راچہ کند
فرزند و عیال و خانمان راچہ کند
دیوانہ کنی و ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہان راچہ کند

اے خدا! جس شخص کو تیری معرفت حاصل ہو جائے اسے جان، مال اور عیال سے کیا سروکار!
تو نے اسے اپنا دیوانہ کر لیا، اور پھر اس کو دو جہان پر اختیار دیتا ہے۔ تیرا دیوانہ بھلا دو جہاں کو کیا کرے گا؟

ایک وقت ہوتا ہے جب تو اسے دونوں جہاں دیتا ہے لیکن وہ ان کو نہیں چاہتا۔ جس دن تک وہ تجھے نہیں پہچانتا وہ ہر چیز چاہتا ہے لیکن اس وقت تو اسے نہیں دیتا۔ مگر جب وہ تجھے پہچان لیتا ہے اور تو اسے ہر چیز دیتا ہے تو اس وقت وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ جس نے تجھے پہچان لیا اگر تو نے اسے تمام چیزیں بھی بخش دیں تو وہ کسی چیز کی جانب توجہ نہیں دیتا کیونکہ تو دنیا اور آخرت سے بلند تر ہے۔

یہاں اگر ہم چاہیں کہ اس موضوع پر اسلام کا نظریہ بیان کریں کہ کیا یہ چیزیں اسلامی معیارات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں تو اس کے لیے وقت نہیں ہے لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ عرفاء کا مطلوب کامل انسان

یہ ہے وہ ایسا انسان ہے جو خدا تک پہنچتا ہے اور جب وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے تو خدا کے تمام اسماء و صفات کا کامل مظہر بن جاتا ہے اور اصطلاح میں وہ ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں ذات حق ظہور کرتی اور جلوہ دکھاتی ہے۔ جیسے ہم نے مکتب فلسفہ کے بیان میں کہا ہے کہ وہ شخص جسے فلسفی کامل انسان سمجھتے ہیں ـــــ اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق نیم کامل ہے، کامل انسان نہیں ہے۔

یہاں ہم اس بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اسلام میں تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کے نام سے کوئی مسئلہ پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ یہ قرآن کے متن میں آیا ہے:

[جس نے اپنے نفس کو گناہ سے پاک رکھا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گناہ سے دبا دیا وہ نامراد رہا۔]

(سورہ شمس ۔ آیت ۹-۱۰)

اس کے بعد قرآن یکے بعد دیگرے گیارہ قسمیں کھاتا اور فرماتا ہے: نجات ان لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے تزکیۂ نفس کیا ـــــ اور بدبخت وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفس اور باطن کو فاسد اور تباہ کر دیا ہے۔ آیا اسلام میں تزکیۂ نفس معرفتِ حق کی جانب ایک راستہ ہے یا معرفت کا راستہ فقط دلیل، برہان اور استدلال ہے جو حکماء اور فلسفیوں کا راستہ ہے۔ بلاشبہ اس حد تک تزکیۂ نفس کے راستے کو اسلام کی تائید حاصل ہے۔ رسول اکرمؐ کا ایک ارشاد ہے جسے شیعہ و سنی دونوں نے روایت کیا اور وہ مسلمات میں سے ہے کہ آپ نے فرمایا:

۹۲ جو شخص چالیس شب و روز خالص اللہ کی یاد میں رہے تو
خدا علم و حکمت کے چشمے اس کے قلب سے اس کی زبان پر
جاری کر دے گا۔ (سفینۃ البحار۔ مادہ خلص)

جو شخص چالیس دن رات تک اپنے آپ کو خدا کے لیے خالص کر لے یعنی چالیس دن رات تک خدا کی رضا کے علاوہ کوئی اور خواہش اس کے وجود پر حاکم نہ ہو۔ چنانچہ وہ خدا کے لیے بولے، خدا کے لیے خاموش رہے، خدا کے لیے دیکھے، خدا کے لیے آنکھیں بند کرے، خدا کے لیے غذا کھائے، خدا کے لیے غذا چھوڑ دے، خدا کے لیے سوئے اور خدا کے لیے جاگے۔

یعنی اپنا ہر عمل اس طرح ترتیب دے کہ سوائے خدا کے کسی دوسری چیز کے لیے قطعاً کوئی کام نہ کرے اور چالیس دن رات تک ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو وہ ابراہیم خلیل اللہ کی طرح ہو جاتا ہے، جن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

۹۳ میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب اللہ
کے لیے ہے۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۱۶۲)

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص اس بات میں کامیاب ہو جائے کہ چالیس دن رات تک ہوا و ہوس کو مکمل طور پر رخصت کر دے اور اس مدت میں کوئی حرکت نہ کرے بجز اس کے کہ وہ خدا کے لیے ہو اور کوئی کام نہ کرے بجز اس کے کہ وہ خدا کے لیے ہو اور اس کی زندگی خدا کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو تو چالیس دن رات کے بعد معرفت اور حکمت کے چشمے اس کے اندر سے ابلتے

اور اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بھی اس علم و تعلیم کا قائل ہے جسے "علم الہامی" کہتے ہیں، یعنی وہ علم جو انسان کے باطن سے صادر ہو۔ صرف یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہ عقلی علم کو قبول کرتا ہے کیونکہ خود اسی کی دعوت دیتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے کہتا ہے:

۹۴ ہم نے اس کو اپنی بارگاہ سے بہرہ ور کیا اور
اپنی طرف سے کچھ علم عنایت کیا۔ (سورۂ کہف۔ آیت ۶۵)

ہمارا ایک بندہ ہے، تم جاؤ اور اس سے علم سیکھو۔

یعنی ہم نے اس بندے کو اپنے پاس سے علم عطا کیا ہے جس نے کسی شخص سے علم نہیں سیکھا بلکہ ہم نے علم کو اس کے اندر و باطن سے جاری کیا ہے۔ اب یہ اسلامی مباحث میں "علم لدنی" کا کلمہ بھی اسی آیت شریفہ سے ماخوذ ہے۔

حافظ شیرازی نے اپنی موزوں زبان میں حدیث کے معنی بیان کیے ہیں:

شنیدم رہروی در سرزمینی
ہمی گفت این معما با قرینی
کہ ای صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینی

میں نے سنا کہ ایک راہگیر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ اے صوفی! شراب صاف اور تیز ہوتی ہے جبکہ وہ چالیس روز تک صراحی میں پڑی رہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

۹۵ اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں کے ارد گرد حرکت نہ کرتے

اور دل میں غبار اور تاریکی پیدا نہ کرتے تو یہ حق تھا کہ تم اپنے دل کی آنکھ کے ساتھ عالم ملکوت کا مشاہدہ کر سکتے۔

(معراج السعادۃ، صفحہ ۱۱)

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے:

۹۶۔ اگر تمہارے دل خواہشوں میں نہ کھوئے ہوتے اور تم بھی چھوٹی باتیں نہ کیا کرتے تو جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے۔

(مسند احمد حنبل، صفحہ ۲۶۶)

اسی مضمون کی ایک اور روایت بھی آئی ہے:

۹۷۔ اگر تم لمبی چوڑی باتیں نہ کیا کرتے اور تمہارے دلوں میں خیالات بھٹکتے نہ رہتے تو تم وہ دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہ سنتے جو میں سنتا ہوں۔ (معراج السعادۃ)

یعنی اگر تم زیادہ بولنے والے نہ ہوتے کہ یہ زبان انسان کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ نیز اگر تمہارے دل کی حالت ایک باغ جیسی نہ ہوتی کہ جس میں ہر حیوان چرتا ہے تو جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھ سکتے اور جو میں سنتا ہوں تم بھی سن سکتے تھے۔ یعنی ان اسرار و رموز کو دیکھنے یا سننے کے لیے انسان کا پیغمبر ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ شخص بھی سن سکتا ہے جو پیغمبر نہ ہو۔ جیسے کہ حضرت مریمؑ سنا کرتی تھیں۔

امام علی علیہ السلام دس سال کے تھے جب وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے۔ وہ مسجد میں بھی آنحضرتؐ کی ہمراہ تھے اور کوہ حرا میں بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جب رسول اکرمؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ کی دعا بدل گئی تھی۔

اس وقت آپ غیب اور ملکوت سے جو آواز سن رہے تھے ـــــ وہ علیؑ بھی سن رہے تھے، جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

۹۸۔ جب آپ پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی۔ جس پر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آواز کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ شیطان ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے۔ (اے علیؑ!) جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو، فرق صرف یہ ہے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ میرے وزیر اور جانشین ہو اور یقیناً بھلائی کے راستے پر ہو۔

(نہج البلاغہ، مفتی جعفر حسین، خطبہ ۱۹۰، صفحہ ۵۳۴)

اہل نفس کی صفائی، خلوص اور ہوا و ہوس کو دور کرنے کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں انسان کے قلب کو صاف کرتی ہیں بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ اور عمدہ اثر رکھتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سے علم و حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے: ایک دن اصحاب نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم میں نفاق کی کوئی بات تو نہیں! آپ دیکھیے کہ وہ مومن لوگ تھے لیکن انہوں نے اپنے اندر ایک ایسی حالت دیکھی کہ ان کے اندر خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم منافق نہ ہوں اور ہمیں پتہ بھی نہ چلے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: کیوں؟ انہوں نے عرض کیا: اس لیے کہ جب ہم آتے ہیں، آپ کی خدمت میں بیٹھتے ہیں، آپ باتیں کرتے ہیں، وعظ

درحقیقت فرماتے ہیں: خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، قیامت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور بتاتے ہیں تو توبہ و استغفار کی بدولت ہم میں ایک رقت بھی اور بلند حالت پیدا ہو جاتی ہے لیکن بعد میں جب ہم آپ کے حضور سے رخصت ہوتے ہیں، بیٹے بیوی بچوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے پاس بیٹھتے ہیں تو اچانک دیکھتے ہیں کہ ہماری پہلی حالت لوٹ گئی ہے اور ہم دو رُخی چلنے والے آدمی ہیں۔ یا رسول اللہ! کیا یہ نفاق نہیں ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں، یہ نفاق نہیں ہے۔ نفاق دورنگی ہے اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور جس کیفیت میں تم ہو وہ دو الگ حالتیں ہیں۔ یعنی بعض اوقات انسان کی روح بلند ہوتی اور اوپر جاتی ہے اور بعض اوقات نیچے آجاتی ہے۔ البتہ جب تم میرے پاس ہوتے ہو اور میری باتیں سنتے ہو تو قدرتی طور پر تم میں روح کی بلندی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر فرمایا کہ میرے پاس تم جس حالت میں ہوتے ہو اگر اس حالت پر باقی رہو تو،

فرشتے آئیں اور تم سے مصافحہ کریں۔ یہاں تک کہ تم پانی کی سطح پر بھی چل سکتے ہو۔ (اصول کافی جلد ۲ باب تنقل حوال قلب)

اگر یہ حالت تم میں ایک ملکہ و فطرت ثانیہ کی شکل میں باقی رہے تو تم ان مقامات پر پہنچ سکتے ہو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری عرفانی ادبیات جو آجکل ادب کے انمول شاہکاروں کا جزو ہیں ان میں جو خوبی ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔

بے اسلام سے کنارے جو جی چاہے لکھیں لیکن وہ تمام لطف جو مولوی مثنوی میں ہے، حافظ شیرازی میں ہے، سعدی شیرازی میں ہے اور ناصر خسرو میں ہے غرض کہ جو لطف و حلاوت ان سب میں ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔

جیسا کہ حافظ نے تصریح کی ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے، قرآن کی بدولت ہے۔ سعدی شیرازی نے اس صاف باطنی اور غیبی چیزوں کو دیکھنے کی قوت کو ایک اور شکل میں حضرت یعقوبؑ کی زبانی اس مطلب کو پیش کیا ہے:

یکی پرسید از آن گم گشتہ فرزند
کہ ای روشن روان پیر خرد مند
ز مصرش بوی پیراہن شنیدی
چرا در چاہ کنعانش ندیدی

حضرت یعقوبؑ کہ جن کے بیٹے حضرت یوسفؑ گم ہو چکے تھے، ایک شخص نے ان سے یہ سوال کیا کہ اے روشن ضمیر بزرگ! آپ نے اپنے بیٹے کی خوشبو مصر سے محسوس کر لی تھی اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے شہر کنعان کے کنوئیں میں اس کو نہ دیکھ پاسکے تھے؟

یہ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی داستان ہے، جب مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اپنا تعارف کرایا اور اپنی قمیض انہیں دی اور کہا کہ یہ لے جاؤ، وہ ابھی کنعان پہنچے نہیں تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا:

یعنی اگر تم مجھے سٹھیایا ہوا نہ سمجھو تو میں یوسفؑ کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ (سورۂ یوسف، آیت ۹۴)

خوب! آپ نے ان کی قمیض کی خوشبو مصر سے تو سونگھ لی لیکن کنعان کے کنوئیں سے ان کی خوشبو محسوس نہ کی جہاں آپ خود رہ رہے تھے یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا؟ آپ نے انہیں کنعان کے کنوئیں ہی میں کیوں نہ دیکھا؟

بگفتا حال ما برق جہان است
دمی پیدا و دیگر دم نہان است

حضرت یعقوبؑ نے جواب دیا کہ ہماری حالت کوندتی ہوئی بجلی کی مانند ہے جو لحظہ بھر کے لیے کوندتی ہے اور دوسرے لمحے ماند ہو جاتی ہے۔

برقی از منزل لیلیٰ بدرخشید سحر
وہ کہ با خرمن مجنون دل افگار چہ کرد

صبح دم لیلیٰ کے گھر سے جو بجلی چمکی، اس نے دکھیارے مجنوں کے دل و جان پر کچھ اور ہی اثر ڈالا۔

معنویات میں برق کی یہ تعبیر امیر المومنینؑ کے یہاں بھی ہے، جیسے سعدی شیرازی کے مطابق اوپر کے شعر میں کہا گیا کہ ہماری حالت کوندتی ہوئی بجلی کی مانند ہے، وہ ایک لحظہ کے لیے کوندتی ہے اور دوسرے لمحے میں ماند جاتی ہے۔

یہاں تک تو اس سوال کا ذکر تھا جو حضرت یعقوبؑ سے کیا گیا اور وہ جواب جو انہوں نے دیا۔ اس کے بعد سعدی کہتے ہیں:

اگر درویش بر حالی بماندی
سر دست از دو عالم برفشاندی

اس وقت درویش کی جو حالت ہوتی ہے اگر وہ باقی رہے تو وہ دونوں جہان سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: میرے قرب میں تمہاری جو حالت ہوتی ہے اگر تم اس پر باقی رہو تو:

فرشتے آئیں اور تم سے مصافحہ کریں، پھر یہ کہ تم پانی کی سطح پر بھی چل سکتے ہو۔

اب ہم ان باتوں کی تائید کے لیے نہج البلاغہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے نوجوان جب نہج البلاغہ میں سے کوئی بات سنتے ہیں تو وہ ان کے دلوں کو زیادہ لگتی ہے اور وہ ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے کئی بار کہا ہے کہ خود نہج البلاغہ بھی امام علی علیہ السلام کی مانند ہے۔ کیونکہ انسان کا کلام خود اس آدمی کی مثل ہوتا ہے۔ کلام انسان کی روح کا نزول ہے اور اسی کی روح کی تجلی ہے۔ ایک پست روح کا کلام پست ہوتا ہے اور ایک بلند روح کا کلام بلند پایہ ہوتا ہے۔ ایک یک جہتی روح کا کلام یک جہتی ہوتا ہے اور ایک ہمہ جہتی روح کا کلام ہمہ جہتی ہوتا ہے۔

چونکہ امام علی علیہ السلام ایک جامع الاضداد شخصیت ہیں اس لیے ان کا کلام بھی جامع الاضداد ہے۔ ان کے کلام میں عرفان، عرفان کی روح، فلسفہ، فلسفے کی روح، آزادی خواہی، آزادی خواہی کی روح، شجاعت، شجاعت کی روح ـــــ اور اخلاق، اخلاق کی روح ہے ـــــ مختصر یہ کہ آپ جو صنف بھی دیکھنا چاہیں، اس کی مثال خود علیؑ ہیں۔ جیسا کہ آپ اپنے ایک جامع کلام میں سالک کے متعلق فرماتے ہیں:

۲۰ (سالک) مومن نے اپنی عقل کو زندہ رکھا اور اپنے نفس کو مار ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کا ڈیل ڈول لاغر اور تن و توش ہلکا ہو گیا۔ اس کے لیے بھرپور درخشندگیوں والا نور ہدایت چمکا کہ جس نے اس کے سامنے راستہ نمایاں کر دیا اور اسے سیدھی راہ پر لے چلا۔ مختلف دروازے اس کو دھکیلتے ہوئے سلامتی کے دروازہ اور ہمیشگی کی قرارگاہ تک لے گئے اور اس کے پاؤں بدن کے سکون کے ساتھ امن و راحت کے مقام پر جم گئے۔ کیونکہ اس نے اپنے دل کو عمل میں لگائے رکھا اور اپنے پروردگار کو راضی و خوشنود کیا تھا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۲۰، صفحہ ۵۹۹)

یوں سالک منزل بہ منزل بلند ہونے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ اس آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے جو سلامتی کی منزل اور اس راستے کی انتہا ہے۔

اس بنا پر کامل انسان کے لیے ان حدود میں پہنچنے تک یہ سوال باقی رہتا ہے وہ ایک سالک انسان ہے یا نہیں؟ کیونکہ کامل انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہو جس نے تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کر لیا ہو۔

اسلام کہتا ہے: ہاں اس سے بھی کچھ بڑھ کر آیا اسلام کا مطلوبہ کامل انسان ـــــ ایک سالک انسان ہے؟ ہاں! وہ اس دروازے سے اس دروازے تک اور اس منزل سے اس منزل تک چلتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک دروازے تک پہنچتا ہے جسے باب السلامہ کہا جاتا ہے۔ آیا خدا سے قرب کی بات درست ہے؟ بلکہ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے

کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ ہاں وہ اپنے خدا کو بھی کسی حد تک دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ پھر وہ ہماری طرح کا نہیں ہوتا جیسا کہ مشہور قول کے مطابق ہمارے غور و فکر تک پہنچے جیسا کہ ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تاکہ خدا کا نشان پائیں، زمین کی طرف دیکھتے ہیں تاکہ خدا کا نشان پائیں۔ بلکہ اس سالک اور کامل انسان کے لیے خدا اس درخت کے پتے اور اس زمین و آسمان سے زیادہ ظہور رکھتا ہے۔

امام حسینؑ بھی یہی فرماتے ہیں:

۲۱ الٰہی کیا تیرے سوا کسی اور کا ظہور ایسا ہے کہ جو تیرے لیے نہیں ہے حتیٰ کہ وہ تیرے لیے ظاہر کرنے والا ہو۔ کیا تو کسی وقت تک پوشیدہ اور اس کا محتاج ہے کہ کوئی راہنما تیری طرف رہنمائی کرے۔ کیا تو اس وقت تک دور ہے کہ آثار و نشانیاں تجھ تک رسائی کرائیں۔ وہ آنکھ اندھی ہو کہ جو تجھے نہیں دیکھتی اور ان نشانیوں پر نظر جمائے رکھتی ہے۔

ایک شخص نے امام علی علیہ السلام سے پوچھا: کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں نے جس خدا کو نہیں دیکھا اس کی ہرگز عبادت نہیں کرتا۔ پھر فرمایا: یہ خیال نہ کرنا کہ میں آنکھ سے دیکھنے کی بات کر رہا ہوں، خدا کسی سمت میں نہیں ہے۔

۲۲ اس (خدا) کو آنکھیں ظاہری طور پر نہیں دیکھتیں لیکن دل اسے ایمان کی حقیقتوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

میں نے اسے ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

اس حد تک عرفاء کے مجوزہ کامل انسان کی اسلام کی جانب سے تائید کی جا سکتی ہے لیکن مکتب عرفان کی طرف سے ایک چیز کی تحقیر کی گئی ہے اور اسلام اس کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ عرفان میں علم اور عقل کی بہت تحقیر کی گئی ہے اور اسی دلیل کی بنا پر عرفان کا مجوزہ کامل انسان ـــــ ایک نیم کامل انسان ہے۔

اسلام جہاں دل کو قبول کرتا ہے وہاں عقل کی بھی تحقیر نہیں کرتا، جہاں دل کو قبول کرتا ہے وہاں عشق کو بھی قبول کرتا ہے اور سیر و سلوک کو بھی قبول کرتا ہے ـــــ لیکن وہ عقل، فکر، استدلال اور منطق کی تحقیر کرنے پر ہرگز تیار نہیں اور وہ ان کا بے حد احترام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروغ اسلام کے بعد کی صدیوں میں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا کہ جس نے دل اور عقل کو ساتھ ساتھ رکھا ہے۔

چنانچہ شیخ اشراق شہاب الدین سہروردی کا تقریباً یہی راستہ ہے اور ان سے پہلے صدر المتألہین ملا صدرا شیرازی ہیں جو ان لوگوں میں سے ہیں جو قرآن کی پیروی کرتے ہوئے عقل اور دل دونوں راستوں کا احترام کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ بوعلی سینا[1] کی طرح دل کے راستے کی تحقیر کریں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ بعض عرفاء اور صوفیوں کی طرح عقل کی تحقیر کریں بلکہ وہ دونوں راستوں کا احترام شمار کرتے ہیں۔

---

[1] بوعلی سینا نے کچھ مدت کے بعد دل یعنی عشق کے راستے کی تحقیر کا نظریہ ترک کر دیا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ اسلام اس بات سے موافق نہیں کہ علم، عقل اور عشق کی تحقیر کی جائے۔ لہٰذا اس تجزیہ کو اسلام کی تائید حاصل نہیں ہے۔ قرآن کا مطلوبہ کامل انسان وہ ہے جس نے عشقی کمال بھی پیدا کیا ہو اور عقلی کمال بھی اس کی شخصیت کا جزو ہو۔

ایک اور مسئلہ جو عرفان کے کامل انسان میں ہے اور اسلام اس کی تائید نہیں کرتا وہ یہ ہے:

عرفان میں انسان کا جھکاؤ فقط اندر کی طرف ہے یعنی باہر کا جھکاؤ اس اندر کے جھکاؤ میں دب گیا ہے۔ اس میں انفرادی پہلو زیادہ نمایاں ہے اور اجتماعی پہلو یوں لگتے ہیں کہ تقریباً مٹ گیا ہے یا اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ عرفان کا مجوزہ کامل انسان ایک اجتماعی انسان نہیں ہے، وہ ایک ایسا انسان ہے جو فقط اپنا سر اپنے گریبان میں ڈالے رکھتا ہے اور بس!

لیکن اسلام کا مطلوبہ کامل انسان دل و عشق، سیر و سلوک، علم، فلسفی و معنوی اور تہذیب نفس کے بارے میں تمام تر باتوں کی تائید کرتے ہوئے اپنے سے باہر بھی جب نکلتا ہے، معاشرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنا سر گریبان میں نہیں ڈالے رہتا۔ اگر وہ رات کو اپنا سر گریبان میں ڈالے رہتا ہے اور دنیا و ما فیہا کو فراموش کر دیتا ہے تو دن کے وقت معاشرے کے درمیان سرگرم عمل بھی ہوتا ہے۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے اصحاب کی تعریف بیان کی گئی ہے اور وہ ہمارے لیے کامل مسلمان اور کامل انسان کے نمونے ہیں۔ ان کے متعلق بہت سی روایات میں آیا ہے:

٭ وہ رات کے وقت مست راہب اور دن کے وقت شیر نر ہیں۔
(سفینۃ البحار، مادہ صحب)

اگر آپ رات کو ان سے ملنے جائیں تو آپ گویا راہبوں سے ملنے جاتے ہیں جو پہاڑی کی ایک غار میں رہتے ہیں اور انہیں عبادت کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا لیکن دن کے وقت وہ شیر نر ہوتے ہیں — یعنی رات کے راہب اور دن کے شیر نر ہیں۔

خود قرآن مجید ان کا یوں ساتھ ذکر کرتا ہے:

٭ یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، (یا صائم ہیں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کام سے روکنے والے اور خدا کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (اے رسولؐ!) مومنین کو خوشخبری دے دو۔
(سورۂ توبہ - آیت ۱۱۲)

اس آیت میں توبہ کرنے والے سے سجدہ کرنے والے تک تمام پہلو انسان کے باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ نیک کام کا حکم دینے والے اور برے کام سے روکنے والے ہیں۔ گویا باطن کے بعد وہ قرآن ان کے باہمی تعلقات اور معاشرے سے ان کے ربطے کو بیان کرتا ہے۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

٭ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحمدل

ہیں، تو ان کو دیکھے گا کہ رکوع اور سجود میں جھکے خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرت سجود سے گٹھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہی اوصاف توریت میں اور یہی صفات انجیل میں بھی مذکور ہیں۔ وہ گویا کھیتی ہیں جس نے پہلے زمین سے سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا تو وہ موٹی ہوئی۔ تب وہ اپنی جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تازگی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی تاکہ ان کی ترقی سے کافروں کو جلائے۔ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے خدا نے ان سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔
(سورہ فتح - آیت ۲۹)

رسول اکرمؐ اور آپ کے ساتھی ان لوگوں کے مقابلے میں جو حق اور حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں، اور وہ لوگ جو حق اور حقیقت کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، ان کے خلاف ثابت قدمی اور قوت کے ساتھ ڈٹ جاتے ہیں اور اہل ایمان کے لیے مکمل طور پر محبت، مہربانی، خیر اور رحمت ہیں۔ یہ معاشرے کی جانب ان کے جہاد کا پہلو ہے اور پھر اس معاشرے کی جانب جھکنے والوں کو آپ رکوع کی حالت میں اور سجود کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ جب کہ وہ اپنے خدا سے فراخی مانگ رہے ہوتے ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر قانع نہیں ہیں بلکہ بار بار زیادہ طلب کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں یعنی وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو دنیا جمع کرنا چاہتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں کیونکہ خدا کی رضا ان کے لیے ہر چیز سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ آپ ان

کے چہروں پر عبادت اور سجدوں کے آثار دیکھتے ہیں۔ یہ ایک اور نقطہ ہے جہاں تصوف کے کامل انسان میں ضعف نظر آتا ہے۔ البتہ مکتب عرفان کے بہت سے پیشرو جو اسلامی تعلیمات کے سخت پابند تھے انہوں نے اس کی جانب توجہ دی اور اپنے کلام میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس پہلو میں کم و بیش افراط پیدا ہو گئی اور "خود" کی جانب جھکاؤ اس حد تک پہنچ گیا کہ "باہر" کی جانب جھکاؤ معدوم ہو گیا ہے، مگر اسلام اس چیز کی تائید نہیں کرتا۔

ایک اور پہلو بھی ہے اور اس کا تعلق "نفس کشی" سے ہے۔ ہماری اسلامی تعبیرات میں "نفس کشی" کا لفظ نہیں ہے۔ اس کی بجائے ہمارے پاس "موتوا قبل ان تموتوا" کی تعلیم ہے۔ یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ، اس میں تہذیب نفس کی جانب اشارہ ہے اور اس کی غرض نفس کی اصلاح ہے۔ تاہم شعراء کی تعبیروں میں "نفس کو مارنا" اور "نفس کشی" کا ذکر زیادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ دوسرے الفاظ بھی آتے ہیں جن کا مطلب اپنے آپ کو توڑنا اور اپنے آپ کو مارنا ہے۔ چنانچہ ہمارے عرفان میں خود بیں نہ ہونے، خود پسند نہ ہونے اور خود خواہ نہ ہونے کے موضوع پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اسلام کا وہ بنیادی نکتہ غفلت کا شکار ہو گیا، جسے ہم کرامت نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اس بارے میں کسی حد تک مفصل بحث ہے اور جیسا کہ میں نے تقریر کے شروع میں کہا تھا کہ عرفاء نے کامل انسان کے بارے میں جو بحث کی ہے وہ بڑی شیریں ہے۔ کیونکہ انہوں نے نظم و نثر کی دونوں زبانوں میں اپنا نظریہ کھل کر بیان کیا اور پھیلایا ہے، لہٰذا اس کا جائزہ

اس نظریے کے مقدر پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ گزشتہ بیشتر ہم اس بلند پایہ عرفان قدر اس انسان یعنی کامل انسان کو ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ عرفاء نے متعارف کرایا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جس بلند مرتبہ انسان کو عرفاء نے متعارف کرایا ہے۔ ہم اس کے بارے میں قدرے کھل کر بحث کریں۔

میں نے اس وقت جو گفتگو کی ہے اس کی غرض یہ تھی کہ میں آپ سے عرض کروں کہ یہ ایک اور کمزور نقطہ ہے۔ انشاء اللہ کل رات میں اس موضوع کے کچھ دوسرے حصوں پر بحث کروں گا۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ

آٹھویں نشست

کامل انسان کے بارے میں اسلامی نظریہ

وہی تو خدا ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) بھیجا کہ جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے، اس سے پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

(سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

ان راتوں میں ہماری یہ گفتگو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کامل انسان کو پہچاننے کی ایک کوشش ہے۔

اس سے پیشتر ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان وہ واحد موجود ہے جو اپنی خصوصیت کو چھوڑ سکتا ہے یعنی ہم کوئی ایسا پتھر نہیں دیکھتے جس میں پتھرپن نہ ہو، جیسے کوئی ایسی بلی نہیں مل سکتی جو بلی پن سے عاری ہو۔ کوئی ایسا کتا نہیں مل سکتا جو [illegible]

دنیا میں آتا ہے وہ اپنی جبلت کی بنا پر وہ خصلتیں رکھتا ہے جنہیں ہم حیوانی کہتے ہیں لیکن یہ انسان ہے جو انسان کی صفت یعنی انسانیت نہیں رکھتا اور دوسری چیزوں سے حاصل کرے گا کیونکہ انسان اپنے حیوانی پہلو سے موجود نہیں ہے [illegible] جسے قدیم زبان میں انسانیت یا آدمیت کا نام دیتے ہیں۔ جیسا کہ سعدی نے کہا:

تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت
نہ ہمیں لباس زیباست نشان آدمیت

انسان کا جسم اس کی روح کی بدولت محترم ہے اور تنہا یہ مناسب جسم ہی آدمیت کی علامت نہیں ہے۔

فلسفی طور پر بھی جانتے ہیں کہ محض یہی نہیں کہ انسان ایک دو وجودی ہے جسے علم حیاتیات کی رو سے ایک انسان ہے یا علم طب کی رو سے ایک انسان ہے تو یہ اس کو انسان کہنے کی کافی وجہ نہیں ہے۔ جب تک وہ آدمی ہو، کئے خود بہت شک میں ہے اور ہر وہ شخص جو ماں کے پیٹ سے آدمی کی صورت لے کر پیدا ہو وہ ضروری نہیں کہ آدمی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

ملا شدن چہ آسان آدم شدن چہ مشکل

ملا بن جانا کتنا آسان اور انسان بننا کس قدر مشکل ہے! یعنی جیسے انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ عالم بالفعل نہیں بلکہ عالم بالقوہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ بالقوہ انسان ہوتا ہے بالفعل انسان نہیں ہوتا۔ بالآخر یہ بھی ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے ہر شخص کو آدمی بننا چاہیے وہ ہر شخص کو یہ جاننا چاہیے کہ خود یہ انسانیت کیا چیز ہے؟ کیونکہ ماہر علم حیاتیات

انسانیت کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا دنیا کے سخت سے سخت مادہ پرست مکاتب بھی انکار نہیں کرتے، تاہم اسے مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ انسان خود اپنے لیے معنویت کا دلدادہ ہے۔ ان میں سے ایک در اصل انسان کا وجود ہے جس کے ذریعے وہ عالم معنی تک پہنچ سکتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ مادی مسائل کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں لیکن وہ محسوس نہیں ہوتیں۔ وہ چیزیں موجود ہیں چھوئی نہیں جا سکتیں در مستقل حیثیت رکھتی ہیں لیکن تجربہ گاہوں میں نہیں ملتیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت ایک ایسی چیز ہے جو علم حیاتیات سے ماوری ہے۔ حتی کہ دنیا کے کٹر مادہ پرست بھی ایسے غیر مادی انسانی امور کے قائل ہیں جنہیں انسانی قدروں کا نام دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اصل انسانی قدروں کو اسلام کی بنیاد پر پہچانیں یعنی ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اسلام اصل انسانی قدروں کی کیا تعریف کرتا ہے؟ ہم مختلف مکاتب کے خیالات پیش کرتے جب تک ان پر تنقید نہ کر لیں کہ جو حقیقی معنوں میں تنقید ہو، اس وقت تک ہم اس بارے میں اسلام کی پیش کردہ توجیہات کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تنقید فقط اعتراض کرنا نہیں بلکہ ان کے عمل کی مانند ایک عمل ہے جو ایک صراف کسی سکے کے متعلق انجام دیتا ہے، یعنی وہ اسے کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس کے کھوٹے کھرا ہونے کا پتا چلاتا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ مثلاً اس میں کتنے فی صد خالص سونا، کتنی دھات چاندی ہے اور کتنی ملاوٹ ہے۔ ہماری تنقید کے معنی ان سارے کے سارے نظریات کو رد کرنے کے نہیں ہیں۔ اس کی بجائے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ فلاسفہ ہونا

اور دوسرے مکاتب نے جو نظریے پیش کیے ہیں وہ اسلامی معیارات پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب تک ہم مختلف مکاتب کے خیالات پیش نہ کریں اور ان کا دقیق مطالعہ و تحقیق نہ کریں اس وقت تک ہم اسلام کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھ سکتے۔ بصورت دیگر ہر شخص یہ دعوے کرے گا کہ انسانی قدریں یہ ہیں اور وہ ہیں یا ان کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ پھر وہ مطمئن بھی ہو گا کیونکہ کوئی شخص اسے ٹوکنے والا نہ ہو گا کہ جناب! یہاں ایک اور چیز بھی ہے یا یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں ہے؟ لیکن جب مختلف مکاتب کا مطالعہ کر لیا جائے ان پر تنقید ہو جائے اور انہیں اسلامی معیار پر جانچ لیا جائے تو ہم منطق اور استدلال کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جناب! اسلام نے انسان کے بارے میں یہ اور یہ قدریں معین کی ہیں۔ پھر ان حساسیتوں کی بنا پر جن کی اسلام نے اس سلسلے میں توصیف و تعریف کی ہے، ہم ان مکاتب کی بنائی ہوئی انسانی قدروں کی فی صد نسبت بتا سکتے ہیں یعنی یہ کہ ان میں کتنے فی صد حقیقت ہے اور ان میں کتنے فیصد! غلط۔ بعض اوقات کچھ لوگ جلدی میں ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: جناب! جہاں تک ہو سکے آپ ہمیں جلدی سے بتا دیں کہ اصل اسلامی قدریں کیا ہیں تاکہ ہم انہیں سمجھ لیں۔ لیکن اگر مکاتب کا مطالعہ کیے بغیر ہی انہیں کچھ بتا دیا جائے تو وہ درست نہیں ہو گا۔ لہٰذا آپ حضرات نے پہلے جو دیگر مختلف مکاتب کا مطالعہ کیا ہے اس پر متنبہ کریں گے۔

گزشتہ نشست میں ہماری بحث مکتب عرفان کے بارے میں تھی۔

مکتب عرفان ــــ حتی کہ اسلامی عرفان کو چھوڑ کر دوسرے عرفانی نظریات سے بہت مختلف ہے۔ اس میں اسلامی تعلیمات کا اثر بہت زیادہ ہے اور

کامل انسان کے بارے میں اس کا نظریہ اسلام کے کامل انسان کے بہت نزدیک ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ تنقید کے قابل ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ مکتبِ عرفان ——— "کامل انسان" کے بارے میں قدیم اور جدید مکاتب کے مقابلے میں زیادہ علم رکھتا ہے پھر بھی یہ تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔

پچھلی نشست میں عرفان کے مطلوبہ کامل انسان پر ہم نے دو میں سے ایک اعتراض کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ انہوں نے عقل کی بیجا تحقیر کی ہے بلکہ بعض اوقات وہ عقل کو بے اعتبار ٹھیراتے اور عشق کو عقل سے بالاتر قرار دیتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بقول حافظ:

جناب عشق را درگہ بسی بالاتر از عقل است

جذبِ عشق کا مقام ——— عقل سے بالاتر ہے۔

وہ عقل کی تحقیر کے سلسلے میں کبھی کبھی فرقہ کی حد تک بھی بڑھ گئے ہیں۔ یعنی بنیادی طور پر انہوں نے تعقل، تفکر، منطق، استدلال اور برہان کو تحت بے اعتبار قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے حجابِ اکبر کا نام دیا ہے۔ چنانچہ اگر انہوں نے دیکھا کہ ایک حکیم و فلسفی عقل کے راستے سے کسی روحانی مقام پر پہنچ گیا ہے تو وہ اس پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ اس بارے میں ایک مشہور داستان بھی ہے جو بعض کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔

بوعلی سینا کا زمانہ چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے اوائل کا ہے اور اس کی وفات ۴۲۸ ہجری میں واقع ہوئی۔ یہ عظیم مشائی عقلی اور خشک حکیم ——— ایک بہت عظیم عارف ابوسعید ابوالخیر کا ہم عصر

تھا۔ بوعلی اپنی جائے پیدائش ماوراء النہر (بلخ و بخارا) میں رہا کرتا تھا۔ بعد میں وہ سلطان محمود کے ڈر کے مارے وہاں سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا کیونکہ سلطان اسے اپنے دربار میں لے جانا چاہتا تھا اور وہ اس پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہ نیشاپور گیا اور وہاں اس نے ابوسعید ابوالخیر سے ملاقات کی۔

کہتے ہیں کہ انہوں نے تین دن رات ایک دوسرے کے ساتھ خلوت کی اور باہم گفتگو کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ نماز با جماعت ادا کرنے کے علاوہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ بعد میں جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور بوعلی سینا وہاں سے چلا گیا تو اس سے پوچھا گیا۔ تم نے ابوسعید کو کیسا پایا؟ بوعلی سینا نے کہا جن چیزوں کو میں عقل کے ذریعے درک کرتا ہوں وہ انہیں آنکھوں کے ذریعے مشاہدہ کرتا ہے اور جب ابوسعید سے سوال کیا گیا کہ تم نے بوعلی سینا کو کیسا پایا؟ ابوسعید نے جواب دیا: جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اسے بھی اپنی عقل کے سہارے وہاں آن پاتا ہے یعنی یہ کہ ہم جس باطنی مقام پر بھی پہنچے وہ بڑے عقلی تکلف سے ہمارے پیچھے آتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرفان عقل کی بے قدری کرتے ہیں۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر ہم قرآن کی منطق کو ایک طرف رکھیں اور اہل عشق و عرفان کی منطق کو دوسری طرف رکھیں تو ان دونوں میں مشابہت کی ہیں۔ عرفان کے مقابلے میں قرآن نفس کی تہذیب کرنے پر زور دیتا ہے اور عقل کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس نے عمل و تفکر حتیٰ کہ بعض عقلی استدلال پر تکیہ کیا ہے۔

عرفاء خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی ——— اپنے سلسلوں کو امیرالمومنین امام علی علیہ السلام سے منسوب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عرفا نیز متعصب ترین سنیوں کے نزدیک بھی عرفان کا سلسلہ امام علی علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے

کہ ان کے ساتھ ستر سلسلوں میں سے فقط ایک سلسلہ ایسا ہے جسے وہ ابوبکر پر ختم کرتے ہیں۔ وہ امام علی کو قطب العارفین سمجھتے ہیں۔ بقول ابن ابی الحدید ان عرفاء نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھا، آپ نے نہج البلاغہ میں اسے چند سطروں میں بیان کر دیا ہے۔ بیشک ایک دوسرے مقام پر آپ گویا فلسفی بن جاتے ہیں اور ایسا فلسفیانہ عقلی استدلال کرتے ہیں کہ کوئی فلسفی آپ کی گرد تک بھی نہیں پہنچ پاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام علی علیہ السلام ہرگز عقل کی تحقیر نہیں کرتے۔

لہٰذا یہاں اسلام کا مطلوب کامل انسان — عرفان کے مطلوب کامل انسان سے اس بنا پر مختلف ہے کہ اسلام کے کامل انسان کے وجود میں عقل ترقی کرتی ہے جب کہ عرفان کا پروردہ کامل انسان عقل کی تحقیر کرتا ہے۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے۔

ز خود بطلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی۔

یعنی جو چیز تو چاہتا ہے کہ تجھے دی جائے وہ اپنے آپ سے طلب کر۔ اپنے آپ سے طلب کرنے کے معنی ہیں کہ اپنے دل سے طلب کر اور اپنے اندر سے طلب کر!

عرفان ایک ایسا مکتب ہے جس کا جھکاؤ اندر کی طرف ہے اور وہ کہتا ہے کہ اپنے دل سے طلب کرو۔

کیونکہ اس مکتب کے حساب میں "دل" ساری دنیا سے وسیع اور عظیم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ ساری دنیا کو ایک طرف رکھ دیں تو دل ساری دنیا سے بڑا ثابت ہوگا۔ ان کے نزدیک دل سے مراد وہ روح الٰہی ہے جو ہر انسان میں پھونکی گئی ہے:

جب میں اسے ہر طرح سے درست کر چکوں اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑنا۔ (سورۂ حجر، آیت ۲۹)

وہ دنیا کو انسان صغیر (چھوٹا انسان) اور دل کو انسان کبیر (بڑا انسان) کہتے ہیں۔ چونکہ وہ دنیا اور دل کو دو مختلف عالم سمجھتے ہیں اس لیے دنیا کو عالم صغیر اور دل کو عالم کبیر کہتے ہیں۔ جبکہ ہم اس دنیا کو عالم کبیر کہتے ہیں اور دل کو اسے عالم صغیر کہتے ہیں۔ گویا کہ اہل عرفان کے نزدیک یہ دنیا انسان صغیر ہے اور انسان کبیر وہ چیز ہے جو آپ کے اندر وجود رکھتی ہے۔

جیسا کہ مولوی معنوی نے کہا ہے:

گر تو آدم زادہ ای چوں او نشین
جملہ ذرات را در خود ببین
چیست اندر خم کہ اندر نہر نیست
چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست
ایں جہان خم است و دل چوں نہر آب
ایں جہان حجرہ است و دل شہری عجاب

اگر تو آدم کا بیٹا ہے تو اسی کی طرح ایک جگہ بیٹھ جا اور دنیا کی ہر چیز کو اپنے ہی اندر دیکھ لے۔

وہ کیا چیز ہے جو تالاب میں ہے اور دریا میں نہیں یا وہ کیا چیز ہے جو گھر میں ہے اور شہر میں نہیں ہے!

یہ دنیا تالاب اور دل ایک دریا ہے۔ یہ دنیا گھر ہے اور دل

ایک شہر ہے۔ (مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۳۶۰)

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز گھر میں ہو اور شہر میں نہ ہو۔ جبکہ خود گھر بھی شہر کا ایک جزو ہے۔ پس جو کچھ گھر میں ہے وہ اس کا نمونہ ہے جو شہر میں ہے۔

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز پانی کے تالاب میں ہو اور دریا میں نہ ہو؟ جو کچھ تالاب میں ہے وہ اس چیز کا ایک چھوٹا سا جزو ہے جو دریا میں ہے۔ کیا انسان گھر کی تلاش میں جاتا ہے یا شہر کی تلاش میں؟ ظاہر ہے کہ جس کا گھر شہر میں ہو وہ شہر کی تلاش میں جاتا ہے۔ کیا انسان ایک تالاب اور چھوٹے سے برتن کی تلاش میں جاتا ہے یا دریا کی تلاش میں؟ ظاہر ہے کہ وہ پانی کے ایک چھوٹے سے برتن کی تلاش میں نہیں بلکہ دریا کی تلاش میں جاتا ہے۔

معلوم ہو کہ عرفان کی بنیاد اندر کی جانب جھکاؤ، دل کی طرف توجہ، باطن کی طرف میلان اور باہر سے قطع تعلق پر قائم ہے اور عرفان یہ ہے کہ وہ باہر کی قدر و قیمت کی نفی کرتا ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا ہم اپنے مطلوب یعنی حق کو باہر کی دنیا سے حاصل کر سکیں گے؟ تو عرفان و تصوف کہتا ہے کہ نہیں! بلکہ اسے اندر ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے:

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

گوہری کز صدف کون و مکاں بیروں بود
طلب از گمشدگان لب دریا می کرد

بیدلی در ہمہ احوال خدا با او بود
او نمی دیدش و از دور خدایا می کرد
مشکل خویش بر پیر مغاں بردم دوش
کو بہ تائید نظر حل معما می کرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کی داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد
گفت آں یار کز او ہست سر دار بلند
جرمش آں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

دل نے ہم سے برسوں روشنی طلب کی ہے، جو چیز خود اس کے پاس تھی وہی غیر سے مانگتا رہا۔

وہ موتی جو زمین و آسمان کی حدوں کے پار ہے، دل اس کی طلب ان سے کرتا ہے جو ساحل سمندر پر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

دل سے ناآشنا شخص کہ خدا ہر وقت اس کے ساتھ تھا، وہ اسے دیکھ نہ سکا اور اے خدا! اے خدا! کہہ کر دور سے پکارتا رہا۔

میں اپنی یہ الجھن لے کر اپنے مرشد کے پاس گیا جو اپنی نگاہ باطن سے نیبی گرہیں کھول دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کو یہ آئینہ کب ملا تھا؟ اس نے کہا جس دن کہ یہ نیلا آسمان بنایا گیا تھا۔

اس نے وہ بات کہی جس سے اس کو سولی پر لٹکا دیا گیا، اس کا جرم یہ تھا کہ راز حقیقت کو فاش کرتا تھا

اپنے باطن کی طرف اس توجہ میں عرفان وہاں تک آگے بڑھ گیا ہے، جہاں تک آپ کی سوچ پہنچتی ہے؛ اس بارے میں مولوی معنوی نے مثنوی کی چھٹی جلد میں ایک تمثیلی داستان بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

ایک آدمی خزانے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ خدا سے دعا کرتا اور کہتا: اے پروردگار! وہ سب لوگ جو دنیا میں آئے ــــ انہوں نے خزانے جمع کیے اور پھر زمین میں دفن کر دیے۔ ایک وقت وہ دنیا سے خود بھی چلے گئے اور ان کے خزانے زمین کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ اے خدا! ان خزانوں میں سے کسی ایک کا پتہ مجھے بتا دے۔ وہ مدتوں رات سے صبح تک گریہ زاری کرتا رہا۔ آخر کار ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص نے اس سے پوچھا: تم خدا سے کیا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا: خدا سے خزانہ چاہتا ہوں۔ اس شخص نے کہا: میں خدا کی طرف سے مامور ہوں کہ تمہیں خزانے کا پتہ بتاؤں۔ اس نے کہا: بہت خوب!

پھر اس شخص نے ایک جگہ کی نشاندہی کی اور کہا: تم تیر کمان لے کر فلاں ٹیلے پر جاؤ اور ایک تیر کمان میں جوڑ کر پھینکو۔ تب وہ تیر جہاں جا کر گرے گا وہیں خزانہ دفن ہے۔ جب وہ شخص جاگا تو اسے خیال آیا کہ یہ بڑا واضح خواب ہے۔ وہ کہنے لگا: میں ابھی وہاں جاتا ہوں، جو نشانیاں بتائی گئی ہیں یا تو درست ہیں یا درست نہیں ہیں۔ اگر یہ نشانیاں درست ہیں تو پھر میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب پہنچ وہ گیا اس نے دیکھا کہ تمام نشانیاں درست ہیں اور مجھے فقط ایک تیر ہی پھینکنا ہے۔ جہاں وہ تیر جا کر گرے گا وہاں سے مجھے خزانہ مل جائیگا۔

وہ وہیں پہنچ گیا اور جو مجھے خواب میں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا کہ تیر کس طرف پھینکنا ہے۔ پھر سوچا: اس وقت تو میں قبلہ کی سمت کو تیر پھینکتا ہوں؛ شاید خدا نے چاہا تو خزانہ اسی طرف سے برآمد ہوگا۔ چنانچہ اس نے کمان میں تیر جوڑا اور پوری قوت کے ساتھ قبلہ کی طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لیے دوڑ لگائی کہ تیر کہاں گرتا ہے۔ اس کے بعد وہ کدال و بیلچہ لے کر گیا۔ تیر گرنے کی جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ تاہم اس نے جتنی گہرائی تک کھودا خزانہ نظر نہ آیا۔ تب اس نے سوچا کہ اب مجھے کسی اور طرف تیر پھینکنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس مرتبہ اس نے شمال کی طرف تیر پھینکا، لیکن خزانہ نہ ملا۔ یہ بڑی دیر تک وہ جنوب مشرق، جنوب مغرب، شمال مشرق، شمال مغرب کی سمتوں میں تیر پھینکتا رہا۔ لیکن خزانہ کہیں سے بھی نہ ملا۔ وہ شخص اس صورت حال سے از حد پریشان ہو گیا۔

وہ دوبارہ مسجد میں گیا اور کہنے لگا: اے پروردگار! یہ تو نے میری کیسی رہنمائی کی کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ بعدہٗ وہ بڑی مدت تک پہلے کی طرح نالہ و زاری کرتا رہا۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو اس نے اسی شخص کو دوبارہ خواب میں دیکھا۔ اس نے اسے سرزنش کی اور کہا کہ تو نے مجھے غلط نشانیاں بتائی تھیں۔ اس نے پوچھا: کیا تمہیں وہ جگہ مل گئی؟ اس نے جواب دیا: ہاں! اس نے پوچھا: پھر تو نے کیا کیا؟ اس نے جواب دیا: میں نے تیر کمان پر چڑھایا اور پوری قوت کے ساتھ قبلہ کی جانب چلا دیا۔ اس نے کہا: میں نے کب کہا تھا کہ تیر قبلہ کی جانب پھینکنا اور یہ کب کہا تھا کہ کمان قوت کے ساتھ کھینچنا۔ میں نے تیر پھینکنے کو نہیں کہا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ تیر جہاں کہیں

گرے گا ——— وہیں سے خزانہ ملے گا۔

دوسرے دن وہ کدال، بیلچہ اور تیر کمان لے کر اس جگہ پہنچا ——— تیر کمان میں رکھا اور کہنے لگا: اب دیکھیے کہ تیر کہاں جاتا ہے؟ جب اس نے تیر چھوڑا تو دیکھا کہ وہ اس کے پاؤں کے قریب ہی گرا ہے۔ تب اس نے اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھودی اور اسے معلوم ہوا کہ خزانہ وہیں ہے۔

یہاں پہنچ کر مولوی معنوی کہتے ہیں:

آنچہ حق است اقرب از حبل الورید
تو فگندی تیر فکرت را بعید
ای کمان و تیرہا بر ساختہ
گنج نزدیک و تو دور انداختہ

حقیقت تو تیری شاہ رگ سے بھی قریب تر ہے اور تو اپنے خیال کا تیر ادھر ادھر پھینکتا ہے۔

اے تیر کمان والے شکاری و سالک، خزانہ تیرے نزدیک ہے اور تو دور دور خیال دوڑاتا ہے۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۸۸۵)

ماضی قریب کے ایک عالم و فاضل کا بیان ہے کہ میں نے یہی داستان ایک واعظ سے پڑھی جو عرفان کا ذوق رکھتا تھا اور اسے مثنوی پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس وقت میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس قصے کا مطلب کیا ہے؟ میں نے واعظ سے پوچھا: مولوی معنوی اس داستان میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ خود بھی اہل حال لوگوں میں سے تھے اور اس نے جواب میں اس

سمجھنے سے زیادہ کچھ نہیں کہا:

اور خدا کی نشانیاں خود تمہارے اندر بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ (سورۂ ذاریات - آیت ۲)

یعنی مولوی معنوی کہنا چاہتے ہیں: اس خزانے کا نشان خود تمہارے اندر ہے، اس بنا پر اسے اپنے آپ سے طلب کرو۔ دل ایک عجیب شہر ہے ——— دنیا ایک مٹکا اور دل نہر ہے ——— دنیا ایک قطرہ ہے اور دل نہر ہے۔ عرفان میں ایسی چیزوں پر غیر معمولی تکیہ کیا گیا ہے یعنی کتب عرفان میں باہر کی دنیا (فطرت) کی بے حد تحقیر کی گئی ہے۔ اہل عرفان کے ہاں فطرت کا تعارف ایک چھوٹی کتاب کے طور پر بھی نہیں کرایا جاتا۔ حالانکہ امیر المومنینؑ سے منسوب کلام میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: دنیا عالم اکبر اور انسان عالم اصغر ہے۔

تیری دوا تیرے اندر ہے اور تجھے خبر نہیں۔ مرض تیرے ہی پاس سے ہوتا ہے اور تو سمجھتا نہیں۔
تو ایک کھلی کتاب ہے کہ جس سے چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔
کیا تو سمجھتا ہے کہ تو ایک حقیر کیڑا ہے اور تیرے اندر یہ بڑی وسیع دنیا سمٹ کر آ گئی ہے۔ (کلام امیر المومنین علیؑ)

اب اگر ہم عرفا کی اس منطق کو قرآن کی منطق کے سامنے رکھیں تو اگرچہ اس میں بہت سے مثبت پہلو موجود ہیں، لیکن از روئے قرآن یہ [illegible] منطق ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ——— فطرت سے اتنی بے اعتنائی

نہیں کرتا بلکہ اس کے نزدیک آفاق و انفس کی آیات ایک دوسری کے پہلو میں ہیں:

ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں اطراف میں اور خود ان کے اندر دکھا دیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے۔ (سورۂ حم سجدہ - آیت ۵۳)

اگرچہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کے لیے بلند ترین اور اعلیٰ ترین معرفت خود اس میں ہے اور اس کے باطن ہی سے ہاتھ آتی ہے۔ تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کے مقابل عالم فطرت کی کوئی وقعت ہی نہ ہو۔ کیا فطرت خدا کی نشانی اور خدا کا آئینہ نہیں اور فقط دل ہی خدا کا آئینہ ہے؟ نہیں —— بلکہ جس طرح دل خدا کا آئینہ ہے، اسی طرح فطرت بھی خدا کا آئینہ ہے۔

یہاں ایک بہت ہی دقیق نکتہ ہے اور اسی کی بنیاد پر میں بالخصوص مکتب عرفان کے بارے میں زیادہ بحث کر رہا ہوں۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ مباحث میں کہا ہے کہ ہماری روحوں کے ساتھ مکتب عرفان کا نسبتاً زیادہ رابطہ رہا ہے، کیونکہ فلسفیوں کی باتیں خود ان کے لیے تھیں اور ان کی کتابیں عام لوگوں کو نہیں پڑھائی گئیں یعنی وہ عوام کے ہاتھوں تک نہیں پہنچیں، لیکن مکتب عرفان میں جو ذوق ہے، جوش ہے، حرارت ہے اور جو حسن و جمال ہے، اس کی بدولت وہ ہمارے گھروں میں نفوذ رکھتا ہے۔ چنانچہ مولوی معنوی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں، سعدی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں اور حافظ بھی ہمارے سب گھروں میں نفوذ رکھتے ہیں۔

لہٰذا اس مکتب کی خوبیوں نے انسان کی بہت خدمت کی ہے اور اگر ان لوگوں میں سے چند ایک کے کلام میں کوئی انحراف یا لغزش واقع ہوئی تو

وہ بھی یہی جگہ پیدا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مکتب فلسفے کے مقابلے میں مکتب عرفان پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔

انسان کا فطرت سے رابطہ

یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ کیا فطرت سے انسان کا رابطہ ایک بیگانے کا بیگانے سے رابطہ ہے؟ کیا یہ ربط سو فیصد بیگانے موجود سے رابطہ ہے؟ حتیٰ کہ اس سے بھی بڑھ کر کیا یہ رابطہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قیدی کا قید خانے سے، ایک پرندے کا پنجرے سے اور یوسفؑ کا چاہ کنعان سے رہا ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ فطرت ہمارے لیے ایک قید خانہ ہے، ایک کنواں ہے یا ایک پنجرہ ہے تو پھر اس سے ہمارا رابطہ —— ضد سے ضد کا ربط ہوگا۔ اس صورت میں فطرت کے حصار میں ہماری کوشش کیا ہونی چاہیے؟ ہاں پنجرے میں بند پرندے کی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے نجات دلائے۔ اس کو کسی چیز سے غرض نہیں اور اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ اس پنجرے سے چھٹکارا پائے۔ ایک قیدی کا قید خانے میں سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ اگر ہو سکے تو دیوار توڑ کر بھاگ نکلے۔ یوسفؑ کو کنوئیں میں اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں تھا کہ کہیں سے کچھ مسافر آئیں اور پانی کے لیے ڈول کنوئیں میں لٹکائیں تو آپ اس کے ذریعے اوپر آ جائیں۔ کیا قرآن اور اسلام —— عالم فطرت کے ساتھ انسان کے ربط کو قیدی اور قید خانے، یوسفؑ اور کنوئیں —— اور پرندے اور پنجرے کا سا رابطہ سمجھتا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ عرفان میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔

سنائی کہتے ہیں:

قفس بشکن چو طاؤوساں یکی بر پر بزن بالا

موروں کی طرح پنجرہ توڑ کر یک دم آسمان پر آ جا!

بقول دیگر:

ای یوسف مصر در آی از چاہ

اے ملک مصر کے سلطان یوسف اس کنوئیں سے نکل جا!

لیکن اسلام کی نظر میں عالم فطرت سے انسان کا کسان اور کھیتی جیسا رابطہ ہے۔ ایک سوداگر کا بازار تجارت سے رابطہ ہے اور ایک عابد کا معبد سے رابطہ ہے۔ ایک کسان کے لیے کھیتی ہدف نہیں بلکہ وسیلہ ہے یعنی اس کا گھر تو شہر میں ہے لیکن وہ اس کھیتی سے اپنی خوشی اور خوش بختی کے وسائل حاصل کرتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ اس زمین کو آباد کرے — کھیت پر جائے، ہل چلائے، بیج بوئے اور اگر گندم کے ساتھ گھاس پھوس اگ آئے تو اسے اکھاڑ پھینکے، پھر فصل کاٹے، اسے گاہے اور غلہ گھر لے آئے — یہ ہوتے ہیں اس کے کرنے کے کام!

تاہم اگر ایک کسان اسی کھیتی کو اپنا گھر سمجھ لے تو یہ اس کی غلطی ہے لیکن پھر بھی کھیتی کے ایک کھیتی ہونے کی بابت اسے غلطی نہیں کھانی چاہیے۔ ایک سوداگر کے لیے بازار کام کی جگہ ہے۔ یعنی وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنا سرمایہ لگاتا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کے لیے بھی یہ دنیا ایک ایسی ہی چیز ہے۔

جیسا کہ رسول اکرم نے فرمایا: [۱۱۰] یہ عالم آخرت کی کھیتی ہے۔

حضرت امیر المومنین نے فرمایا:

[۱۱۱] یہ دنیا دوستانِ خدا کی تجارت گاہ ہے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۳۱ صفحہ ۸۴۶)

ایک شخص امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور دنیا کی مذمت کرنی شروع کر دی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ امام علی دنیا کی مذمت کرتے ہیں لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیا کی کس چیز کی مذمت کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دنیا کی مثلاً عالم فطرت کی مذمت کرتے ہیں جو حق پرستی اور حقیقت پرستی کی ضد اور تمام انسانی قدروں کی نفی کے مترادف ہے۔ اس نے کہا: دنیا بری جگہ ہے۔ اس پر امام علی برہم ہوگئے اور فرمایا:

[۱۱۲] اے دنیا کی برائی کرنے والے اور اس کی غلط سلط باتوں کے دھوکے میں آنے والے! تم اس پر گرویدہ بھی ہوتے ہو اور پھر اس کی مذمت بھی کرتے ہو۔ کیا تم دنیا کو مجرم ٹھیرانے کا حق رکھتے ہو یا وہ تمہیں مجرم ٹھیرائے تو حق بجانب ہے؟

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۱۳۰ صفحہ ۸۴۵)

میں نے اس بارے میں ایک مثال بیان کی ہے اور وہ کچھ اس طرح ہے: ایک بڑھیا مصنوعی بناؤ سنگھار کے ساتھ آتی ہے اور ایک جوان کو دھوکا دیتی ہے۔ اس کے دانت بھی مصنوعی ہیں اور سر کے بال بھی مصنوعی ہیں لیکن وہ بیچارہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک جوان عورت ہے پھر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ بڑھیا — بڑھیا ہی کے روپ میں آ کر کہتی ہے:

میری عمر زیادہ ہے۔ میرے منہ میں ایک دانت بھی نہیں، میرے سر کے بال بھی مصنوعی ہیں اور بس میں ایسی ہوں جیسی نظر آتی ہوں ــــ کیا تم میرے ساتھ نکاح کرنے کو تیار ہو؟ اگرچہ وہ کہا کرے کہ میرے دانت نہیں ہیں اور میرے بال بھی نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ جوان کہے کہ یہ سب قابلِ توجیہ باتیں ہیں تو درحقیقت اس عورت نے اسے دھوکا نہیں دیا بلکہ خود اس جوان نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔

امام علیؑ فرماتے ہیں:

جب دنیا نے کوئی چیز مخفی نہیں رکھی تو پھر اس نے تجھے دھوکا کب دیا ہے؟ کیا دنیا نے تجھے اس دن کا دھوکا دیا جس دن تو نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھوں دفن کیا؟ دنیا کہتی ہے میں جو ہوں سو ہوں اور مجھ میں ثبات نہیں ہے، وہ کہتی ہے تو بھی ایسی ہی کچھ ہے جیسی کہ میں ہوں۔ تو مجھے اس طرح کیوں یاد کرنا چاہتا ہے جیسے تو خیال کرتا ہے ــــ حالانکہ میں کسی بھی صورت میں دنیا فریب نہیں دیتی۔

جیسا کہ سلسلۂ بیان میں فرمایا: اے انسان! دھوکہ مت کھا۔

کیا تو نے دنیا پر تہمت لگائی ہے یا دنیا نے تیرے ساتھ تہمت کی ہے؟ تو خود اس دنیا کو دھوکا دے رہا ہے یا دنیا تجھے دھوکا دے رہی ہے؟ اس نے تجھے کب دھوکا دیا ہے اور کب فریب کیا ہے؟ وہ تو وہی ہے جو اپنی عیاشی خوبصورتی کے نیچے چل رہی ہے۔ پھر بھی فرماتے ہیں: دنیا اولیائے خدا کی تجارت کا بازار ہے اور خدا کے دوستوں کی مسجد ہے۔ اگر مسجد نہ ہو تو کیا خدا کی عبادت کر سکتا ہے؟ اگر بازار نہ ہو تو کیا سودا کر کے تجارت کر کے نفع کما سکتے ہیں؟

دنیا انسان کے لیے ایک قیدخانہ ہے، کنواں ہے یا پنجرہ ہے اور انسان کا وظیفہ اس پنجرے اور اس کنویں سے باہر نکلنا ہے۔ یہ روح و نفس کی معرفت اس اصول پر مبنی ہے جسے اسلام قبول نہیں کرتا۔ بلکہ یہ وہی تصور ہے جو قدیم زمانے سے یونان اور ہندوستان میں موجود تھا۔ وہ اصول یہ ہے کہ انسان کی روح ایک اور دنیا میں پیدا کی گئی اور پھر اسے اس دنیا میں لا کر قید کر دیا گیا جیسے پرندے کو پنجرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اگر بات یوں ہی ہو تو اس نے جیسے پنجرے کو توڑنا ایک جائز اور درست عمل ہے۔ لیکن قرآن مجید دوسرے نظریے میں ایک بڑی عجیب تعبیر بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ صدر المتالہین ملا صدرا شیرازی کہتے ہیں:

میں نے روح کے جسمانیۃ الحدوث ہونے اور روحانیۃ البقاء ہونے کا نظریہ اس آیت سے دریافت کیا ہے۔ اس آیت میں انسان کے بارے میں بحث کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔"

(سورۂ مومنون۔ آیت ۱۲)

وہ بعد ازاں پہلے نطفہ بنا، نطفے سے علقہ (جما ہوا خون)، علقے سے مضغہ گوشت کا لوتھڑا بنا، بعد میں ہڈیاں بنیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا گیا، حتیٰ کہ فرمایا گیا:

"پھر اس کے بعد ہم نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔" (سورۂ مومنون۔ آیت ۱۴)

یعنی ہم نے اسی مادے اور طبیعت کو ایک دوسری چیز ــــ روح

میں تبدیل کر دیا' گویا کہ روح اسی طبیعت سے پیدا ہوئی ہے۔ گو روح مجرد ہے لیکن یہ اسی مادے ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ کسی درجہ مقیم نہیں تھی کہ وہاں کامل ہوئی اور پھر یہاں پنجرے میں ڈال دی گئی ہو۔ یہاں وہ اپنی ماں کے دامن میں ہے' اس لیے کہ مادہ روحِ انسان کی ماں ہے۔ چنانچہ جب انسان عالمِ فطرت میں زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اپنی ماں کے دامن میں رہتا ہے۔ لہٰذا اسے یہیں سے بتدریج ترقی کرنی چاہیے نہ یہ کہ اس نے پہلے ہی یہ ترقی کرلی۔ اور اسے قید خانے اور کنوئیں میں ڈال دیا گیا ہو اور پھر کنوئیں سے باہر نکلے۔ یہ اسلام کا تصور نہیں ـــــ بلکہ اسلام کہتا ہے:

ثُمَّ پھر ہم نے اسے پست حالت کی طرف پھیر دیا' مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے....

(سورۂ تین۔ آیت ۶)

اے انسان! تجھے ہمیشہ اپنی ماں (یعنی فطرت) کے دامن ہی میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر تو اپنی فطرت سے بلند نہیں ہوگا اور اوپر نہیں آئے گا تو پھر تو ایک جنسی موجود ہو کر رہ جائے گا' ہاں تو پھر "ہم نے اسے پست حالت کی طرف پھیر دیا" کا مصداق بن جائے گا' اور اگر تو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے تو اس مقام پر نہیں ہوگا پست حالت میں رہے گا۔ پس اگر انسان پست حالت ہی میں رہے جو فطرت کی پستی ہے اور اوپر نہ جائے تو دنیا اس کے لیے جہنم بن جاتی ہے:

جس شخص کے نیکی کے پلے بھاری ہوں گے وہ من بھاتے عیش میں ہوگا اور جس کے نیکی کے پلے ہلکے ہوں گے

تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے۔ اور تم کو کیا معلوم کہ ہاویہ کیا ہے؟
وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔ (سورۂ قارعہ۔ آیت ۶ تا ۱۱)

اگر انسان فطرت کی پستی میں رہے تو اس کی ماں وہی جہنم ہے۔ حالانکہ یہ سب موجود ہے جسے خدائے تعالیٰ نے اس ماں کے دامن میں اس لیے رکھا ہے کہ وہ اس کے دامن سے نکلے اور بلند سے بلند تر ہو جائے۔ یعنی وہ ماں کی گود سے نکل کر مدرسے میں جائے اور ترقی کے مختلف مدارج طے کرے۔ اگر وہ ماں کے دامن ہی میں رہ جائے تو ہمیشہ کے لیے بچہ ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو ۲۵ سال کی عمر میں ماں کے دودھ کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔

پس اسلام کی انسان شناسی اور جہان شناسی میں انسان ایک پہلے سے موجود پرندہ نہیں جو عالمِ قدس کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہو اور پھر اس کو اس کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا:

طائر عالم قدسم چہ دہم شرح فراق

میں عالمِ قدس کا ایک پرندہ ہوں اور اس دنیا میں رہتے ہوئے
اس جدائی کو کس طرح بیان کروں۔

یعنی عالمِ قدس کا طائر ہونے کے باعث اس کا وظیفہ یہ ہو کہ دنیا کے گھونسلے کو توڑ کر عالمِ قدس ہی میں چلا جائے ـــــ مگر اسلام اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ اب آپ نے سن لیا ہوگا کہ عالمِ ارواح کو عالمِ اجسام پر برتری حاصل ہے یعنی روح ایک پرندہ ہے جس کی پیدائش اسی عالم میں ہوئی۔ لیکن ایک اور نور ہے یہ جو عالمِ بالا سے اس عالم پر چمکا ـــــ نہ کہ سالم روح ایک اور جگہ پر

تھی اور پھر اس کو دنیا میں لا کر گویا پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ یکسر ایک غلط تصور ہے —— یہ نظریہ تناسخ ہے جو درحقیقت ایک ہندی اور افلاطونی تصور ہے۔

یونانیوں میں افلاطون کا بھی یہ اعتقاد تھا کہ انسان کی روح اس عالم سے پہلے ایک ایسے عالم میں پروان چڑھتی جو ایک مثالی عالم ہے۔ پھر کسی مصلحت کے تحت اسے یہاں لا کر قید کر دیا گیا، لہٰذا اسے یہاں سے خلاصی پا کر اسی پہلے عالم میں لوٹ جانا چاہیے۔ لیکن اسلام اس دنیا اور فطرت کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تمام عرفا نے ایسی ہی غلطی کھائی ہے —— نہیں، کیونکہ بزرگ عرفا نے بعض اوقات اپنے کلمات میں اس نکتے کی جانب توجہ دی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو معاشرے کی جانب میلان کو ترک کیا، اور نہ فطرت کی جانب سے توجہ ہٹائی ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن نے آفاق و انفس کی آیات اور نشانیوں کا ذکر ایک دوسرے کے ساتھ کیا ہے۔ ان بزرگ عرفا نے بھی اس نکتے پر پوری پوری توجہ دی ہے کہ فطرت خدا کا آئینہ ہے، خدا کا محل ہے اور خدا کے حسن کا آئینہ بھی ہے۔

کیا وہ شبستری ہی نہیں جو اپنی ایک بلند پایہ و شاہکار نظم میں کہتے ہیں

بنام آنکہ جان را فکرت آموخت
چراغ جان بنور دل بر افروخت
ز فضلش ہر دو عالم گشت روشن
ز فیضش خاک آدم گشت گلشن

اس خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جس نے روح کو فکر و خیال کی قوت عطا فرمائی اور اسے دل کی روشنی سے چمکایا۔

اس خدا کے فضل سے دونوں جہان ظاہر و عیاں ہوئے اور اس کے کرم سے اولاد آدم میں رنگا رنگ پھول کھلے۔

حتیٰ کہ قرآنی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں:

بہ نزد آنکہ جانش در تجلی است
ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است
عرض اعراب و جوہر چوں حروف است
مراتب ہمچو اعراب و وقوف است

وہ شخص کہ جس کی روح میں نور ہے، ساری دنیا اس کے لیے خدا کی کتاب ہے۔

اس کے نزدیک دنیا کا باطن حروف، اس کا ظاہر اعراب اور اس کے مراتب حرکت و وقف کی مانند ہیں۔

اسی ذیل میں جامی فرماتے ہیں:

جہاں مرآت حسن شاہد ما است
فشاہد وجہہ فی کل مرآت

یہ دنیا ہمارے معشوق حقیقی کے حسن کا آئینہ ہے۔ جیسا کہ ہر آئینہ میں اس کا رخ زیبا نظر آ رہا ہے۔

اگر ہم قرآن کو ایک طرف اور عرفان کو دوسری طرف رکھ کر دیکھیں کہ قرآن اور عرفان نے عالم پر کتنی توجہ دی ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عرفان

کے مقابلے میں قرآن نے اس طرف زیادہ توجہ دی ہے اور پھر اس نے نفس اور باطن نفس کی جانب توجہ اور رجوع کے مسئلے کا کسی طرح سے انکار بھی نہیں کیا۔ پس قرآن کا بتایا ہوا کامل انسان عقل اور دل کے ساتھ ساتھ فطرت کی جانب بھی میلان رکھتا ہے۔ ایک اور مسئلہ ترکِ خودی کا ہے۔ عرفان دل کو سمجھاتا ہے لیکن اس چیز کو حقیر شمار کرتا ہے جو نفس کے نام سے قرآن میں آئی ہے۔ عرفان کی تبلیغات کا ایک حصہ خودی کا ترک کرنا ہے جو اپنے آپ کی نفی کی طرف اور خود بینی کی نفی کی طرف جاتا ہے۔ یہ بات کسی ذات کی حد تک درست ہے اور اسلام بھی اس کی تائید کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں دو قسم کی خودیاں اور دو نفس ہیں چنانچہ اسلام جہاں ایک قسم کی خودی کی نفی کرتا ہے اور مٹا رہا ہے وہاں دوسرے قسم کی خودی کو انسان میں زندہ کرتا ہے جو بڑی دقیق چیز ہے۔ ان دونوں کی مثال یہی ہے جیسے انسان کا ایک دوست اور ایک دشمن ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہوں۔ اگر ہم اس دشمن کو تیر مارنا چاہیں تو ضروری ہے کہ ہم احتیاط کریں اور دوست کو بچائیں کیونکہ ذرا سی غلطی خطرناک ہو سکتی ہے۔ یہ دو قسم کی خودیاں انسان کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوستہ ہیں کہ بعض یہ خودی موسیقی کا مرتب ہے، اسے کوئی ماہر شکاری ہی ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے اور دوسری قسم کی خودی جو تمام انسانی قدروں کی حامل ہے، اس کو نقصان سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اسلام کا معجزہ یہ ہے کہ اس نے ہر دو قسم کی خودی کا تعین اتنی دقت سے کیا کہ ان کی پہچان میں کوئی مغالطہ نہیں ہونے پاتا لیکن عرفان میں بعض اوقات یہ تشخیص ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ اسلیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دشمن خودی کو ضرب

لگانے کی بجائے دوست "خودی" کو ضرب لگاتا ہے یعنی انسان خود قربان ہو جاتا ہے ـــــ وہ چیز قربان ہو جاتی ہے جسے وہ دل اور انسان کہتے ہیں۔ اس طرح بجائے اس کے کہ نفس مر جائے، یہ بہت ہی دقیق نکتہ ہے اور انشاء اللہ ہم آئندہ نشست میں ان مطالب کے بارے میں اپنا بیان جاری رکھیں گے

لا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

نویں نشست

کامل انسان اور مختلف نظریات (۴)

٭لہ جس نے دنیا میں سر اٹھایا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی، اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔ مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے جی کو خواہشوں سے روکتا رہا، تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہے۔

(سورۂ نازعات۔ آیات ۳۷ تا ۴۱)

مکتب عرفان میں کامل انسان کے بارے میں ایک اہم مسئلہ انسان کا اپنے نفس کے ساتھ رابطہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایک اسلامی مسئلہ بھی ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ خود خواہی، خود پرستی اور ہوائے نفس کا مقابلہ کرنے کی بات اہل تصوف کی زبان پر بھی ہے اور اسلام کی تعلیمات عالیہ میں بھی موجود ہے بلکہ یہاں اور وہاں کی یہ تعبیر بھی کسی حد تک درست ہے کیونکہ مسلم عرفاء نے ان مسائل میں اسلام ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے اور ان کی سبھی

تعبیرات اسلامی ہیں۔ ہم یہاں اس معاملے کے بارے میں ایک وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

"خودی" جسے عربی میں "نفس" کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ نفس کو انسان کے لیے ایک اندرونی دشمن قرار دیا جاتا ہے۔

سعدی کہتے ہیں:

تو با دشمن نفس ہم خانہ ای
چہ در بند پیکار بیگانہ ای

تو اپنے نفس کے ساتھ رہتا ہے جو تیرا دشمن ہے، پھر دوسروں سے جھگڑے کرنے میں کیوں لگا ہوا ہے۔

٭لہ یعنی تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ خطرناک خود تمہارا نفس ہے۔ (الحدیث) جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان رہتا ہے۔

سعدی گلستان میں کہتے ہیں:

ایک عارف سے پوچھا گیا: رسول کرمؐ نے یہ حدیث کس لیے ارشاد فرمائی۔ یعنی خود تمہارا نفس، تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا خطرناک دشمن ہے۔ اس نے جواب دیا: حضور اکرمؐ نے یہ اس لیے فرمایا کہ اگر تم اپنے کسی دشمن سے نیکی کرو اور جو مانگے اسے دیدو تو وہ تمہارا دوست بن جاتا ہے سوائے نفس کے کہ تم اس کی جتنی مدارات کرو وہ اتنا ہی زیادہ تمہارا دشمن بن جاتا ہے۔

پس عرفاء نے نفس پر ایک دشمن کے طور پر نگاہ ڈالی ہے۔ یہ نفس وہی چیز ہے جسے ہم "خودی"، "نفس پرستی" یا "خود پرستی" کہتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ "خود خواہی" کہ جسے برا اور ناپسندیدہ کہا جاتا ہے، وہ کیا چیز ہے؟

خود خواہی کا ایک درجہ اور ایک قسم یہ ہے کہ انسان اپنے محور پر گھومتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف اپنے لیے کام کرتا ہے اور اس کے سارے کام اور کوششیں اپنے لیے ہوتی ہیں اور وہ خود اپنا محور ہوتا ہے صبح سے جب وہ اٹھتا ہے اور کام شروع کرتا ہے تو رات تک اس کی تمام کوششیں اس کی اپنی زندگی کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پیٹ کی خاطر سیر ہو کر کھاتا ہے اور اپنے بدن کی خاطر کپڑے پہنتا ہے اور مکان بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس میں رہ سکے۔ اگر انسان اپنے لیے اس حد تک سرگرم عمل ہو تو کیا یہ اخلاق کے خلاف اور ایک غیر اخلاقی کام ہے؟ نہیں۔ یہ اخلاق کی ضد بھی نہیں ہے اور کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔

قرآن انسان کے لیے تین مقامات کا قائل ہے۔ ایک "حیوان سے بالاتر" دوسرے "حیوان کے ساتھ ہم رتبہ" اور تیسرے "حیوان سے کمتر" یعنی حیوانیت کا مقام ہے۔ جو ہستی کی حیثیت میں وہ حیوان کے ساتھ ہم درجہ ہو جاتا ہے ــــ کبھی وہ اپنے اندر کچھ صفات پیدا کرتا ہے تو حیوان سے بلند اور فرشتے سے بالاتر ہو جاتا ہے ــــ منفی صفات پیدا کر لیتا ہے تو حد سے نیچے گر کر حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے۔ انسان کی اس بلندی اور پستی کے نتیجے میں اس کا کردار بھی تین قسم کا ہوتا ہے۔

حامل اخلاق یعنی حیوان کی حد سے بالاتر

ضد اخلاق یعنی حیوان کے درجے سے پست تر

نہ حامل اخلاق اور نہ ضد اخلاق۔

اگر آپ کو دنیا میں ایک ایسا انسان مل جائے کہ جو کبوتر یا بکری کی خصلت رکھتا ہو یعنی وہ انسان کہ جس کو فقط اپنی فکر رہتی ہو تو وہ حیوان کی حد میں ہے، اس میں اخلاق نہیں ہے۔ لیکن اس کا طریقہ ضد اخلاق بھی نہیں ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہ انسان بس اپنی زندگی کی فکر میں ہوتا ہے اور اپنے پیٹ کو سیر کرنا چاہتا ہے۔ کسی قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں درحقیقت اس کا وہ انسانی مقام آتا ہے جب وہ اپنی حیوانیت کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی حیوانیت کا نتیجہ خودکشی کی شکل میں نکلتا ہے۔ اگر ایک کبوتر دانہ دنکا جمع کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ سیر ہو جائے اور یہ ایک عادی فعل ہے۔ ایک گھوڑا اس لیے چرتا ہے کہ وہ سیر ہو جائے اور یہ بھی ایک عادی فعل ہے۔ اگر ایک انسان بھی اس حد میں رہنا چاہے تو یہ اس کا ایک عادی فعل ہے یعنی وہ بھی ایک حیوان ہے۔

لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جب انسان ہوائے نفسانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ بلکہ وہ اس لیے کماتا ہے کہ جمع کرے اور پھر وہ خواہ جتنا بھی جمع کرے ــــ کچھ اور بھی جمع کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ جمع کرنے میں اس کی کوئی حد نہیں ہوتی ــــ اور انسان کی بجائے وہ حرص و ہوا کا مبتلا بن جاتا ہے۔ پھر جب وہ چاہتا ہے کہ ان میں سے کسی کو کچھ دے یا احسان کرے تو وہ بخل کا شکار ہو جاتا ہے ــــ حرص کی طرح بخل بھی ایک بیماری

ہے۔ بخل کی بیماری بڑھتی ہے تو وہ امساک یعنی مال کو روکے رکھنے کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں سورۂ حشر کی نویں آیت میں "شح" (حرص و بخل) کا ذکر آیا ہے اور رسول اکرمؐ کی تعبیر کے مطابق ایسا شخص "شح مطاع" میں مبتلا ہوتا ہے۔
(تحف العقول صفحہ ۴۱)

یعنی اس کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ جو اس پر حاکم ہوتی ہے وہ خود یا اس کی فکر یا اس کی عقل یا ارادہ کوئی بھی اس کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ وہی نفسیاتی کیفیت اس پر حاکم ہوتی ہے جس نے اس کی روح پر دولت کا عشق جما رکھا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کے علاوہ اس کے عمل میں کسی قاعدے قانون اور عقل و منطق کا بھی کوئی عمل دخل نہیں ہوتا کیونکہ اگر اس کی عقل اور فکر اپنا کام کرے تو وہ سمجھ جائے کہ یہ خرچ کرنے کا مقام ہے۔ یعنی جانتا ہے کہ اس کی بھلائی، اس کی مصلحت، اس کی منفعت، اس کی خوشی اور اس کی خوش بختی خرچ کرنے میں ہے۔ لیکن بخل اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی یہ حالت اخلاق کے منافی ہے۔ ایسی حرص سے حیوان سے پست تر بنا دیتی ہے۔ اسی موقع پر ہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی حالت اخلاق کے منافی ہے اور وہ ایک بیمار ہے۔

بات فقط اتنی نہیں ہے کہ انسان کا نفس حرص اور بخل وغیرہ سے دوچار ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی یہ اپنی اصلیت میں بہت سی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جو بدنی بیماریوں سے زیادہ پرخطر اور زیادہ مشکل ہو جاتی ہیں۔ یعنی ایسی بیماریاں جو بنیادی طور پر عقل و منطق سے سازگار نہیں اور فقط اسی بیماری سے متعلق رکھتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں "بخل" "نفسیاتی مرض"۔

ہو جاتا ہے۔ جیسے حسد کی کیفیت اور یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو عقل و منطق کی ضد ہے۔ یعنی انسان اپنے اندر ایک ایسی حالت پیدا کر لیتا ہے جس میں وہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ تب وہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی خوش بختی کی فکر میں ہو ـــــ ہمیشہ دوسرے کی بدبختی کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اس کی آرزو یہ نہیں ہوتی کہ وہ خود خوش بخت ہو اور اگر ہوتی ہے تو پھر اس کے ساتھ یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا بدبخت ہو جائے۔ اب بتائیں کہ یہ چیز کس منطق سے مطابقت رکھتی ہے؟ جبکہ یہ سوچ کسی حیوان میں بھی نہیں ہوتی کہ وہ کسی دوسرے حیوان کی بدبختی کی آرزو رکھتا ہو۔ ایک حیوان کو فقط اپنے پیٹ کی فکر ہوتی ہے اور بس! لیکن وہ انسان کہ جس میں کسی دوسرے انسان کی بدبختی کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان میں تکبر کی کیفیت اور ایسے ہی دوسرے نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ امراض ایسے نفس کے باطن میں یوں چھپے ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی ان سے بے خبر ہوتا ہے۔

یہ وہ مشکلات ہیں جو خود انسان کا نفس ہی اس کے لیے پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہی نفس انسان کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ گویا کہ خود انسان ہی اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے ـــــ پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ انسان خود اپنے غرور سے دھوکا کھاتا ہے۔

قرآن اس کی تعبیر یوں کرتا ہے:

قال یعقوبؑ نے کہا بلکہ یہ بات تم نے اپنے دل سے گھڑ لی۔ خیر صبر و شکر۔ مجھے تو خدا سے امید ہے کہ میرے سب بیٹوں کو میرے پاس پہنچائے گا۔ (سورۂ یوسف۔ آیت ۸۳)

تسویل (خود کو خوشنما کرنا)، ایک بے حد دقیق نفسیاتی تعبیر ہے جو قرآن میں آئی ہے۔ یعنی ہر شخص کسی نہ کسی وقت اپنے اندر سے دھوکا کھاتا ہے۔ جب انسان کا نفس کسی چیز کو چاہتا ہے تو اسے انسان کے سامنے اس طرح جلوہ گر کرتا ہے، اس کی آرائش کرتا ہے، اسے زینت دیتا ہے اور اس پر ایسے جھوٹے نقش و نگار بناتا ہے کہ انسان خیال کرتا ہے —— بس یہی چیز ہے جو اسے حاصل کرنی چاہیے۔ ہاں یہ انسان کا باطن ہی ہے جس سے یہ کام آسان ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے۔

یہ بڑی عجیب تعبیر ہے —— آجکل جب کہ علم نفسیات نے ترقی کر لی ہے۔ اس علم کے ماہرین نے ان نکات تک بڑی باریکی سے رسائی حاصل کی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچے ہیں کہ بعض اوقات انسان دیوانہ ہو جاتا ہے، جبکہ اس کی کوئی اعصابی یا جسمانی وجہ موجود نہیں ہوتی اور وہ کسی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بعض اوقات ایک انسان سخت مصائب سے دوچار ہو جاتا ہے اور پھر انسان کی روح اپنے آپ کو ان دکھوں کے کرب سے بچانے کے لیے عقل کو چھٹی دے دیتی ہے۔ چنانچہ یہ علم نفسیات کا ایک اصول ہے۔

جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

ز ہشیاران عالم ہر کہ را دیدم غمی دارد
دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمی دارد

میں نے دنیا کے عاقل لوگوں میں سے ہر ایک کو پریشان پایا ہے۔
اے دل دیوانہ ہو جا کہ دیوانگی کی بھی اپنی ایک دنیا ہے۔

بہرحال نفس کا مکر و فریب انسان کا دوسرے کے ساتھ مکر کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے نفس کا خود اس کے ساتھ مکر ہے جو بجائے خود ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔

قرآن میں ان نکات کی جانب اچھی طرح سے توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ تری دو مسئلے کہ جو انسان کو متضاد اخلاق کی کیفیت میں داخل کرتے ہیں، عصبانی بنا دیتے اور حیوانات سے بھی پست تر کر دیتے ہیں، ان کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے —— حتیٰ کہ ایسے نکات اٹھائے گئے ہیں جو واقعی حیرت انگیز ہیں۔ یعنی آج کا انسان تعجب کرتا ہے کہ ان لوگوں نے چودہ سو سال پہلے کیونکر وہ دقیق نکتے بیان کیے ہیں جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علم نفسیات اس موجودہ صدی میں ان کی گہرائی تک پہنچ رہا ہے۔ ہم یہ بات بلاخوف و یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان مسائل میں عرفاء کا مآخذ قرآن ہے اور انہوں نے قرآن ہی سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ مختصر یہ عرفاء با استعداد لوگ ہیں اور جب انہیں قرآن کا ایک لفظ یا ایک اشارہ بھی ہاتھ لگتا ہے تو وہ اس میں مضمر نکتے کا بڑی عمدگی سے پیچھا کر سکتے ہیں اور اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مثلاً یہاں ہم تسویل کے بارے میں مولوی معنوی سے ایک نکتہ نقل کرتے ہیں۔

آجکل یہ بات مسلم ہے کہ بعض اوقات انسان کے باطنی شعور میں بعض چیزیں یا یوں کہیے کہ بعض عزائم بیٹھ جاتی ہیں۔ چونکہ وہ ظاہر نہیں ہوتیں —— اس لیے انسان کو خود بھی ان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر اگر خاص حالات میں کچھ محرکات پیدا ہو جائیں تو اچانک وہ دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کی روح کی گہرائی سے ابھر رہی ہیں۔ اس صورت حال پر انسان خود تعجب کرتا ہے

ور اسے یقین نہیں آتا کہ اس کی روح میں ایسی چیزیں بھی موجود تھیں۔ بعض وقت انسان اپنے آپ پر نگاہ ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے تو اسے یقین آجاتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی کدورت نہیں ہے۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی کینہ نہیں رکھتا، کسی سے حسد نہیں کرتا، تکبر نہیں کرتا اور وہ خود بین نہیں ہے لیکن کسی وقت ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ اچانک دیکھتا ہے کہ کئی ایک تکبر، غرور، حسد و کینے اس کی روح کے اندر سے باہر آ رہے ہیں جن کی بنیاد کا بھی پتہ نہیں چلتا جیسا کہا گیا ہے:

نفس اژدرہاست او کی مردہ است
از غم بی آلتی افسردہ است

نفس ایک اژدہا ہے وہ کہاں مرا ہے بلکہ وہ تو موقع نہ ملنے سے پریشان ہو کر گرا ہوا ہے۔ (مثنوی مولانا روم صفحہ ۲۸۹)

مولوی معنوی کہتے ہیں:

انسان کا نفس سانپ کی مثال رکھتا ہے جو سردیوں میں ٹھٹھر جاتا ہے اور اگر انسان اس پر ہاتھ پھیرتا ہے تو بھی وہ حرکت نہیں کرتا۔ حتی کہ بچے بھی ایک کھلونے کی طرح اس سے کھیلتے رہتے ہیں لیکن وہ ان کو کچھ ضرر نہیں پہنچاتا۔ تب انسان یہ سمجھتا ہے کہ سانپ بالکل رام ہو گیا ہے۔ لیکن جونہی اس پر موسم گرما کی دھوپ پڑتی ہے اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ چنانچہ مولوی معنوی نے یہ بات ایک مفصل داستان میں بیان کی ہے۔

مولوی معنوی نے ایک اور مقام پر یہ بات اس انداز میں کہی ہے کہ تحلیل نفس کے ماہرین حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ وہ انسان کی پوشیدہ اور

سوئی ہوئی خواہشات کے بارے میں کہتے ہیں:

میل ہا ہمچون سگان خفتہ اند
اندریشان خیر و شر بنہفتہ اند
چونکہ قدرت نیست خفتند این رمہ
ہمچو ہیزم پارہ ہا و تن زدہ

نفسانی خواہشیں سوئے ہوئے کتوں کی طرح ہیں کہ ان کی اچھائی برائی چھپی رہتی ہے۔

چونکہ ان کو پورا کرنے کی قوت نہیں ہوتی اس لیے وہ جلانے کی ٹوٹی پھوٹی لکڑیوں کی طرح اوپر نیچے پڑی رہتی ہیں۔

(مثنوی مولانا روم صفحہ ۲۸۹)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات پانچ دس کتے ایک جگہ سوئے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سر پنجوں پر رکھے آنکھیں بند کیے یوں آرام سے سوئے ہوتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے یہ بھیڑ یا بھیڑ کا بچہ ہے جو یوں گہری نیند سو رہا ہے۔

تا کہ مرداری درآید درمیان
نفخ صور حرص کوبد بر سگان
چون در آن کوچہ خری مردار شد
صد سگ خفتہ بدان بیدار شد

جب سوئے ہوئے کتوں کے کہیں قریب مردار آجاتا ہے تو ان کی حرص چیخ کر جاگ اٹھتی ہے۔

چنانچہ کسی گلی میں کسی گدھے کا مردار پھینکا جاتا ہے تو سی کے

سے بکروں کتے جاگ کر آجاتے ہیں (مثنوی حوالہ سابق)

یعنی اگر کسی شے میں ایک جانور کا مردہ سامنے آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ کتے کتنا غل مچاتے ہیں اور اچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ ان کی آنکھیں باہر نکل پڑتی ہیں۔ ان کے حلق سے غور غور کی آواز نکلتی ہے اور ان کے بدن کے تمام بال کھڑے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ مولوی معنوی بیان کرتے ہیں:

حرص ہای رفتہ اندر کتم غیب
تا ختن آورد و سر برزد ز جیب
مو بموی ہر سگی دندان شدہ
وز برای حیلہ دم جنبان شدہ

جو خواہشیں کہیں دبی پڑی ہوتی ہیں، وقت آنے پر ان میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تیزی سے ابھر آتی ہیں۔ تب ہر کتے کا ایک ایک بال نوکیلا دانت بن جاتا ہے اور وہ دم ہلا کر مردار کی طرف بڑھتا ہے۔ (مثنوی حوالہ سابق)

پھر کہتے ہیں:

صد چنین اندرین تن خفتہ اند
چون شکاری نیست شان بنہفتہ اند

اسی طرح انسان کے بدن کے اندر سینکڑوں خواہشیں دبی پڑی ہیں اور چونکہ شکار نظر میں نہیں ہے اس لیے وہ کتوں کی مانند سوئی ہوئی ہیں۔ (مثنوی حوالہ سابق)

یہ کتنی بڑی حقیقت ہے! یہاں تک تمام مطالب درست اور بڑے

دقیق ہیں۔ نیز قرآن اور حدیث کے شواہد بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اس نفس کے خلاف جنگ اور جہاد کرنا چاہیے۔ قرآن مجید بھی فرماتا ہے کہ نفس امارہ کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔

جس نے دنیا میں سر اٹھایا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔ مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور اپنے جی کو خواہشوں سے روکتا رہا تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہے۔

(سورۂ نازعات۔ آیت ۳۷ تا ۴۱)

ایک اور آیت میں ہے:

۲۳۔ بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ (سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۳)

ایک اور مقام پر قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی بیان کرتا ہے:

۵۳۔ اور میں تو میں بھی اپنے نفس کو بے قصور نہیں کہتا ہوں، کیونکہ نفس برابر برائی کے لیے اکساتا ہے۔

(سورۂ یوسف۔ آیت ۵۳)

حضرت یوسفؑ اپنے آپ سے مطمئن نہیں جب یہ کہتے ہیں: "نفس برابر برائی کے لیے اکساتا ہے"، وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کے نفس کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ ممکن ہے کسی وقت مجھ سے کوئی بات سرزد ہو جائے کیونکہ کوئی چیز ایسی بھی ہو سکتی ہے جس کو انسان سمجھ نہ پائے۔ لہٰذا میں کبھی بھی اپنے نفس پر اعتماد نہیں کرتا تاکہ وہ کہیں شرارت نہ کرنے لگے۔

"جہادِ نفس" اسلام کا خاص موضوع ہے۔ جب کچھ لوگ ایک غزوہ سے واپس آئے اور رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر نگاہ ڈالی اور فرمایا:

"آفرین ہے ان لوگوں پر جو چھوٹی جنگ سے واپس آئے ہیں اور ایک بڑی جنگ ابھی ان کے ذمہ ہے۔"

(وسائل الشیعہ جلد ۲ باب ۱)

صحابہ نے عرض کیا:

یا رسول اللہؐ! بڑی جنگ کیا ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ اپنے نفس کے خلاف جنگ ہے۔

لیکن جہادِ نفس یعنی خود خواہی سے جنگ اور خود کو پچھاڑنے کے مرحلے میں ہمارے عرفان و تصوف کے بزرگوں کے قول میں بعض اوقات ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جس کی اسلام تائید نہیں کرتا۔ ایسا ہی ایک مرحلہ سخت ترین ریاضتیں ہیں اور اسلام جب یہاں پہنچتا ہے تو قدم روک لیتا ہے۔ تب اسلام کہتا ہے: تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ رسولِ اکرمؐ کے کچھ صحابہ بھی ایسی ہی سخت ریاضتیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم آنحضرتؐ نے ان کے اس ارادے کی شدت سے مخالفت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسی سخت ریاضتیں کرتے ہیں جن کی اسلام تائید نہیں کرتا۔

ریاضت اور نفس کے ساتھ جہاد کے مسئلے کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ریاضت کی شکل یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے بدن پر سختی کرتے ہیں۔ بہت ہی کم غذا کھاتے ہیں اور بہت ہی کم سوتے ہیں۔ یہ ریاضت اہلِ ہند

میں عام ہے۔

(۲) مجاہدہ بالنفس، یعنی نفس کی خواہش کے خلاف چلنا ہے۔ ان کا یہ عمل کسی حد تک درست ہے لیکن یہاں ہم ایسی چیزیں بھی دیکھتے ہیں جو اسلام کی منطق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ یعنی اسلام کا مطلوب کامل انسان ایسا نہیں ہوتا۔

ان میں سے ایک وہ روش ہے جو بعض اہلِ تصوف کا معمول رہی ہے۔ یہ روش کبھی کی تو نہیں لیکن اس سے کہ روش سب پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ اسے "ملامتی روش" کا نام دیا گیا ہے اور یہ ریاکاری کی ضد ہے۔ ریاکار آدمی کا باطن برا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو نیک ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ ملامتی روش والا انسان نیک ہوتا ہے لیکن اس غرض سے کہ لوگ اس کے معتقد نہ ہو جائیں خود کو برا ظاہر کرتا ہے۔ یعنی وہ شراب نہیں پیتا لیکن ظاہر کرتا ہے کہ وہ شرابی ہے۔ وہ زنا نہیں کرتا لیکن اس کے طور طریقے ایسے ہوتے ہیں جن سے لوگ یہ سمجھیں کہ وہ فاسق و فاجر ہے۔

وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے: میں یہ کام اس لیے کرتا ہوں تاکہ نفس کو ماروں اور نفس حقیقتاً مر جائے۔ یہ نفس کے ساتھ جنگ لڑنا واقعی ایک شدید اور مشکل کام ہے۔ نفس چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کی عزت ہو، وہ ہر دلعزیز ہو اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوں لیکن وہ شخص جان بوجھ کر ایسے کام کرتا ہے کہ لوگوں کا اس پر اعتماد قائم نہ ہونے پائے۔ وہ شخص چور نہیں لیکن دکھاوے کا چور بن جاتا ہے اور لوگوں کا مال ایک جگہ سے جا کر چھپا دیتا ہے تاکہ لوگ آئیں اور اسے ڈنڈے ماریں لیکن اگر انہیں پتہ نہیں چلتا

تو وہ ان کاموں کو دوسروں کی نظروں سے چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ شراب کی بوتل لیے ساتھ ہی لیے پھرتا ہے حالانکہ شراب نہیں۔

کیا یہ چیز اسلامی منطق سے مطابقت رکھتی ہے؟ نہیں — بلکہ اسلام یہ کہتا ہے: بندۂ مومن کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر نہیں ہے۔ وہ یہ حق نہیں رکھتا کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے لوگوں کے درمیان اس کی عزت و احترام اور امانت و آبرو پر حرف آئے۔

اسلام یہ بھی کہتا ہے۔ جب تم نیک نہیں ہو تو ریاکاری نہ کرو اور نیکی کا دکھاوا نہ کرو لیکن بُرائی کا بھی جھوٹا دکھاوا نہ کرو۔ یہ دونوں جھوٹ ہیں اور جھوٹ ایک بُرا عمل ہے۔

عرفانی ادبیات میں بلند اور مقدس مطالب کو فسق و فجور کے الفاظ میں نیز معشوق، شراب اور بانسری کی زبان سے بیان کیا گیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ریاکار صوفیوں سے اس چیز کا دکھاوا کیا جاتا تھا جو ان کے اندر موجود نہ تھی۔

حافظ کے ہاں یہ بات کچھ زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ حافظ بعض دفعہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں ریاکار نہیں اور ملامتی بھی نہیں ہوں۔

دلا دلالت خیرت کنم به راه نجات
مکن به فسق مباهات و زهد هم مفروش

اے دل! میں تجھے نجات کا راستہ بتاتا ہوں کہ برائی پر شیخی
نہ کر اور پارسائی کا ڈھنڈورا بھی نہ پیٹتا رہ۔

بہرحال ملامتی روش نفس کے خلاف ایک قسم کا صوفیانہ جہاد ہے جسے

اسلام قبول نہیں کرتا۔ گرچہ تمام صوفیوں کی یہ روش نہیں رہی اور خود جب ملامتی جیسے صوفیوں پر فقط شریعت کے آداب کا غلبہ رہا ہے۔ یہاں ایک گروہ کی یہی روش رہی ہے اور خراسان کے صوفیوں میں زیادہ تر ملامتی ہی گزرے ہیں۔

مکتب تصوف میں بعض اوقات نفس کے ساتھ جہاد کے سلسلے میں اپنے آپ کو پست اور ذلیل کر دیا جاتا ہے تاکہ نفس کو رام کر کے سرکشی یا ابھارنے سے باز رکھا جائے۔ اس طرح نفس یہاں تک بے بس ہو جاتا ہے کہ ایک بے موقع پر جب انسان کو یہی حیثیت کا اظہار کرنا ہوتا ہے — وہ اب نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ چیز جسے ہم باعث عزت نفس کا نام دیتے ہیں۔ تصوف کے بعض مکاتب میں اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے سلسلے ہیں کہ جن میں سالک کے لیے اپنے استاد اور شیخ کی اطاعت ہی واجب ہوتی ہے اور وہ استاد اسے بعض اوقات ایسے کام کرنے کا حکم دیتا ہے جو بہت ہی ذلیل اور پست ہوتے ہیں۔

مثلاً اس کا یہ طریقہ ہے کہ ایک وقت تک جب لوگوں کا گزر جمع ہوتا رہے حمام کے ذخیرہ کا کام کرے — اس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ کام تمہارے نفس کو توڑنے کے لیے ضروری ہے۔ بعض حالات میں یہ لوگ نفس کشی کی خاطر ایسے ذلیل کام کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ابراہیم ادہم کہ جو تصوف کے مشائخ میں سے ہے۔ وہ ایک شہزادہ تھا خود شاہی سے بھاگ نکلا اور خلوت، سلوک اور نفس کشی کی حالت میں زندگی

گزارے لگا۔ ابن ابی محمد نقل کرتا ہے ابراہیم ادھم نے کہا: میں اپنی ساری زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں ہوا جتنا ان تین موقعوں پر ہوا:

(۱) ایک موقع پر میں بری حالت بیماری ایک مسجد میں پڑا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں مسجد کا خادم آیا اور اس نے سب کو اٹھا دیا — میں چونکہ اٹھ نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے میرے پاؤں پکڑے اور ایک لاش کی طرح باہر پھینک دیا۔ اس موقع پر میں بہت خوش ہوا، کیونکہ میں نے دیکھا کہ میرا نفس جو وہاں بڑائی کا احساس کر رہا تھا وہاں اس کو خوب رگیدا اور ذلیل کیا گیا۔

(۲) دوسرا موقع وہ ہے جب کہ ہم لوگ ایک کشتی پر سوار تھے کشتی میں ایک مسخرا بھی تھا جو لوگوں کا دل بہلانے کے لیے نقلیں کر رہا تھا۔ لوگ کشتی میں بیٹھے تھے اور اس مسخرے نے انہیں ہنسی مذاق میں لگا رکھا تھا۔ پھر اس نے چٹکلہ کہا: جی ہاں — فلاں جگہ ایک کافر تھا۔ میں وہاں گیا اور جاتے ہی اس کی ڈاڑھی پکڑ لی اور اسے گھسیٹا۔ یہ کہہ کر اس نے مجلس پر نگاہ ڈالی — وہ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جو تختۂ مشق کا کام دے اور وہ اسے عملی مظاہرہ کا وسیلہ بنائے۔ تب اس کو کشتی میں مجھ سے زیادہ گھٹیا آدمی کوئی نظر نہ آیا — اس نے آکر میری ڈاڑھی پکڑ لی اور مجھے گھسیٹا۔ اس پر کشتی میں موجود سب لوگ ہنسنے لگے اور میں بھی بہت خوش ہوا، کیونکہ اس طرح میرے نفس کی خوب پٹائی ہو گئی۔

(۳) تیسرا موقع وہ ہے جب کہ میں گرمیوں کے موسم میں ایک جگہ بیٹھا

تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری پوستین میں اتنی زیادہ جوئیں تھیں کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں جوئیں زیادہ ہیں یا پشم زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک ایسا موقع تھا کہ جب میں بہت خوش ہوا کہ میرے نفس کو اپنی ذلت نظر آگئی۔ بلاشبہ یہ نفس کے خلاف جنگ اور جہاد ہے لیکن یہ ایسا جہاد بالنفس ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ کیوں؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنے آپ کو یوں ذلیل کرے۔ وہ مسخرہ لوگوں کو ہنسانا چاہتا تھا۔ دراصل اس کا یہ فعل غلط تھا اور وہ ابراہیم ادھم کی توہین کرنا چاہتا تھا۔ یہ فعلی یہ غلطی یہ ہوئی کہ ابراہیم ادھم نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اسلام کہتا ہے کہ مومن کا نفس معزز اور محترم ہے۔ اسلام کی منطق کے مطابق ابراہیم ادھم پر واجب تھا کہ وہ وہاں اس مسخرے کا مقابلہ کرتا، اس کو روکتا، اپنا دفاع کرتا اور اپنی عزت و حرمت کا تحفظ کرتا۔

ایک اور صوفی کہتا ہے: ایک شخص نے ماہ رمضان المبارک میں مجھ کو اپنے ہاں روزہ افطار کرنے کی دعوت دی لیکن جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ دوسری شام کو اس نے پھر دعوت دی۔ میں دوبارہ اس کے گھر گیا تو اس نے پہلے کی طرح میرا راستہ روک دیا۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم عجیب آدمی ہو، یہ بھی دیکھتے ہو کہ میں تمہیں اندر نہیں آنے دیتا، اس کے باوجود بار بار چلے آتے ہو — ہاں کتے بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ تاہم اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کو اس قدر ذلیل و خوار کرے۔

کیونکہ اسلام میں ہم ایک طرف تو اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں نفس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نفس کے خلاف جنگ کرنی چاہیے اور اسے مار ڈالنا چاہیے لیکن جب ہم ایک مقام پر جاتے ہیں تو وہاں اسلام میں اسی انداز کے مطابق بلکہ اس سے بھی زیادہ "عزت نفس"، "قوت نفس" اور "کرامت نفس" کی بات ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ مومن کا نفس معزز اور محترم ہے۔ یہاں تک کہ تمام اسلامی اخلاق کی بنیاد انسان کے کرامت نفس اور شرافت نفس کی طرف توجہ دینے پر ہے اور اسلام کہتا ہے کہ اپنے نفس کی کرامت اور شرافت کو ہرگز واگذار نہ کرو۔ اسلام ایک طرف تو کہتا ہے کہ نفس کے خلاف جہاد کرو اور دوسری طرف کہتا ہے کہ اپنے نفس کی شرافت کو بٹہ نہ لگاؤ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا دو نفس وجود رکھتے ہیں جن میں سے ایک کے خلاف جنگ کی جائے اور دوسرے کو قابل احترام سمجھا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دو نفس — "دو شخص" کے معنوں میں وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ نفس ایک ہی ہے اور اس ایک ہی نفس کے بلند اور پست درجے ہیں۔ یہ نفس اپنے بلند درجے میں صاحب شرف ہے اور پست درجے میں کمینہ ہے اور جب یہ اپنی گزرگاہ سے باہر پاؤں نکالنے لگے تو اسے روک دینا چاہیے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہمارے عرفاء کی زبان میں اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسی لیے ان کے بیانات میں جہاں نفس سے جہاد کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس جہاد میں نفس امارہ کے ساتھ نفس شریف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے — بلکہ نفس شریف کے ساتھ بھی جہاد کرنے کو کہا گیا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ انسان کی واقعی "خودی" کیا چیز ہے۔ فلسفی اس بارے میں ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی "خودی" اس کی روح ہے۔

آج کل کے ماہرین نفسیات کم از کم اس حد تک پہنچے ہیں کہ انسان کی "خودی" کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کے وجود کا خود اسے بھی علم نہیں یعنی وہ اس کے ظاہری شعور میں وجود نہیں رکھتا۔ یعنی آپ جس "خودی" یا ذات کا احساس کرتے ہیں وہ آپ کی ذات کا ایک چھوٹا سا جزو ہے اور اپنی ذات کے ایک بیشتر حصے کو آپ جانتے ہی نہیں ہیں۔

تحلیل نفس کے کچھ ماہرین بھی زیادہ گہرائی میں گئے ہیں اور انہوں نے فلسفیوں کی مخالفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلسفیوں نے انسان کی روح کو اس کی "خودی" قرار دے کر غلطی کی ہے اور وہ انسان کی روح کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں خودی اس سے کہیں زیادہ دقیق اور عمیق ہے۔ اس مقام پر عرفاء نے فلسفیوں کے مقابلے میں اپنا کمال فکر و نظر دکھایا ہے۔ شبستری نے کہا:

منی تو برتر از جان و تن آمد
کہ جان و تن ز اجزای من آمد

تیری خودی (میں)، تیرے بدن اور روح سے بلند تر ہے۔
کیونکہ روح و بدن تیری خودی کے حصے ہیں۔

عارف کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی حقیقی "من" (خودی، یعنی "میں") کو اس وقت دریافت کرتا ہے جب وہ خدا کو دریافت کر لیتا ہے ورنہ "خودی" کا شعور خود

خدا کے شہود سے کسی وقت جدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

۱۴۳ اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھلا بیٹھے تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ یہی لوگ تو بدکردار ہیں۔ (سورۂ حشر، آیت ۱۹)

وہ اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ جہاں تک فلسفیوں نے اسے سمجھا ہے انسان کی "خودی" اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ چنانچہ محی الدین عربی جو اسلامی عرفان کا باوا آدم ہے، وہ بوعلی سینا جیسے فلسفیوں کی بڑی تحقیر کرتا ہے۔ وہ تمام عرفا جو ساتویں صدی کے بعد آئے اور نظری عرفان رکھتے تھے اسی کے مکتب کے شاگرد تھے۔ تاہم عرفا نے فکری نقطۂ نگاہ سے بہت وسعت پائی اور فارسی عربی دونوں زبانوں میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

مولوی معنوی نے یہ بات ایک مقام پر بڑے عجیب طریقے سے بیان کی ہے:

ای تو در پیکار خود را باخته
دیگران را تو ز خود نشناخته
تو به هر صورت که آیی بیستی
که منم این، والله آن تو نیستی
یک زمان تنها بمانی تو ز خلق
در غم و اندیشه مانی تا به حلق
این تو کی باشی که تو آن اوحدی
که خوش و زیبا و سرمست خودی

اے انسان! تو نے اس جنگ میں اپنے آپ کو گنوا دیا اور خود کو

دوسروں میں سے پہچانا نہیں ہے۔

تو جس صورت میں آیا یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ میں ہوں، مگر خدا کی قسم وہ تو نہیں ہے۔

اگر تو ایک مدت تک لوگوں سے الگ رہ کر گلے گلے تک فکر و غم میں ڈوب جا۔

یوں تجھے پتہ چلے گا کہ تو وہ شخص نہیں ہے جو بے حال میں خوش اور بے فکر تھا۔ (مثنوی مولانا روم، صفحہ ۳۹۰)

قرآن مجید فرماتا ہے:

۱۴۴ اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ دراصل گھاٹے میں تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کا گھاٹا کیا۔

(سورۂ زمر، آیت ۱۵)

سب سے بڑا جوا اور سب سے بڑی ہار یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہار جائے۔ خدا کی طرف توجہ کہ جو عبادت کی روح اور حقیقت ہے۔ اس کا مآل اپنی شخصیت اور اپنے نفس کو دوبارہ پا لینا ہے۔

پس اس بنا پر عرفا نے نفس کا مسئلہ اس حد تک تو حل کر لیا ہے۔ تاہم ان کے ہاں نفس کے خلاف جہاد کے معاملے میں ہم نفس کی اس کرامت، عزت و شرافت کا ذکر بہت ہی کم دیکھتے ہیں، جس کی بدولت انسان بلند مقامات پر پہنچتا ہے۔ چنانچہ عرفان میں اس مسئلے پر بہت کم بحث ہوئی ہے اور اس بارے میں انہوں نے اسلامی احکام سے بہت کم فیضان حاصل کیا ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسلام میں نفس کے متعلق یہ

مسائل بھی ہیں:

نفس کو برائی سے روکنا۔ نفس بار بار برائی پر اکساتا ہے۔ جس نے نفس کو پاک رکھا وہ کامیاب اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد ہوا۔ مرنے سے پہلے مر جاؤ وغیرہ۔ نیز اس ضمن میں کچھ اور چیزوں کو بھی مد نظر رکھا گیا اور عزت نفس کو مرکز توجہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

۱۲۵ عزت تو خاص خدا، اس کے رسولؐ اور مومنوں کے لیے ہے۔ (سورۂ منافقون۔ آیت ۸)

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

۱۲۶ اپنی حاجتیں پوری کرنے میں عزت نفس کا خیال رکھو، ہاں تو سارے کام ایک اندازے سے ہوتے ہیں۔

یعنی اگر تم حاجت رکھتے ہو تو دوسروں سے ذلت کے ساتھ حاجت طلب نہ کرو بلکہ عزت نفس کے ساتھ مانگو یعنی اپنی عزت کو داغدار نہ کرو۔ اب ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ میں اپنے نفس کی خود پسندی کو شکست دینے کے لیے بھکاری کی شکل میں کچھ مانگنا چاہتا ہوں، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ اگر تم کوئی حاجت رکھتے ہو تو تمہارا سوال عزت نفس کے ساتھ ہونا چاہیے۔

امام علی علیہ السلام میدان جنگ میں فرماتے ہیں:

۱۲۷ تمہارا ان سے دب جانا جیتے جی موت ہے اور غالب آ کر مرنا بھی جینے کے برابر ہے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۵۱ صفحہ ۱۹۳)

مرا عار آید از این زندگی
کہ سالار باشم کنم بندگی
من مردہ و گریہ دوستان!
بہ از زندہ و خندہ دشمنان

مجھے ایسی زندگی سے عار آتی ہے کہ کسی کا غلام ہو کر رہا کروں۔ میری میت پر دوستوں کا رونا، میری زندگی میں مجھ پر دشمنوں کے ہنسنے سے بہتر ہے۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

۱۲۸ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔

(حیاۃ امام حسین جلد صفحہ ۱۸۳)

امام حسین علیہ السلام یہ نہیں فرماتے کہ نفس کے ساتھ جہاد کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یزید اور ابن زیاد کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور اس صورت میں ہم اپنے نفس کے خلاف بہتر جہاد کریں گے۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ نے مزید فرمایا:

۱۲۹ آگاہ ہو جاؤ کہ کمینے باپ کے کمینے بیٹے ابن زیاد نے مجھے دو باتوں کے بیچ لا کھڑا کیا ہے یعنی جنگ یا غلامی، لیکن کہاں میں اور کہاں غلامی؟ خدا اس پر راضی نہیں ہوتا کہ ہم غلامی کی ذلت میں پڑیں۔ ہمارے لیے خدا کے رسولؐ کے لیے اور مومنوں کے لیے عزت ہی عزت ہے۔ ہاں ہم وہ ہیں جن کا تعلق پاک و پاکیزہ سلسلے

سے ہے۔ (مقتل حسین مقرم، صفحہ ۲۸۷)

یعنی کہاں ہم کہاں ذلت پر راضی ہونا، خدا کی رضا یہ نہیں کہ ہم ذلت اٹھانے پر آمادہ ہو جائیں پھر میرے کوئی ذاتی احساسات بھی نہیں کیونکہ خود میرا مکتب ہی مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ یعنی میرا خدا مجھے ذلت اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ میرا پیغمبر مجھے ذلت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور میری تربیت مجھے ذلت میں پڑنے کی اجازت نہیں دیتی ...... میں علیؑ و فاطمہؑ کے دامن میں پرورش پا چکا ہوں ——

"میں ہرگز ذلت کا ہاتھ تمہیں نہیں دوں گا، غلاموں کی طرح نہیں بھاگوں گا، اطاعت قبول نہیں کروں گا اور ذلت پر راضی نہیں ہوں گا۔"

یہی تعبیرات قرآن، حدیث اور ائمہ علیہم السلام کے کلمات میں اور بالخصوص امام حسینؑ کے کلمات میں بہت زیادہ ہیں۔

میں نے مسجد جاوید میں ایک بات کہی تھی جس کی وضاحت کرنے کے لیے میں اسے یہاں دہرانے لگا ہوں:

کہ میں نے ایک نشست میں کہا تھا کہ یہ جملہ "زندگی عقیدہ اور اس کے لیے جہاد ہے" جو کچھ عرصے سے امام حسینؑ کے نام سے معروف ہے، یہ کسی ماخذ میں نقل نہیں ہوا اور اس بات پر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اس کے معنی بھی درست نہیں ہیں اور یہ امام حسین علیہ السلام کی منطق کے ساتھ مطابقت بھی نہیں رکھتا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ انسان کی زندگی ایک عقیدہ اور اس کی راہ میں جہاد سے عبارت ہے۔ اسلام میں عقیدے کی نہیں حق کی گفتگو ہے اور زندگی

یہ ہے کہ انسان حق کو دریافت کرے اور اس کے راستے میں جہاد کرے۔ یہ مسئلہ کہ عقیدے کی راہ میں جہاد کرنا چاہیے دراصل فرنگیوں کی سوچ ہے جو بعد میں مسلمانوں میں بھی مشہور ہو گئی ہے۔ چونکہ میں نے دیکھا ہے کہ کچھ نوجوانوں کو میرا یہ کہنا برا لگا کہ یہ جملہ امام حسینؑ کا نہیں لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی وضاحت کروں۔ ہم پرانی نسل دماری نہیں، کے مقابلے میں نوجوان نسل کے احترام کے قائل ہیں۔ کیونکہ ہم نوجوان نسل کو حقیقت کا متلاشی سمجھتے ہیں نہ کہ متعصب جس نے ایک عقیدہ اپنا لیا خواہ وہ بغیر دلیل کے ہی کیوں نہ ہو۔ اگر فرض کریں کہ نوجوان نسل کے دماغ میں جو چیز بیٹھ جائے وہ نہیں نکل سکتی تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہ نسل بھی پرانی نسل جیسی ہے یعنی یک جمود ہے۔ جیسے لگتا تھا اور دوسرا آپ اوپر لگاتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بھی بغیر دلیل کے اپنے عقیدے سے چمٹے ہوئے تھے اور آپ بھی بغیر دلیل کے چمٹے ہوئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنے ایک دوست کی زبان سے سن رہے ہیں کہ یہ جملہ منطقی طور پر اسلام سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ہی کسی کتاب میں اس کا مدرک اور سند درج ہے۔ اب فرض کیجیے کہ مخالفوں اور دشمنوں میں سے ایک شخص آئے اور آپ سے پوچھے: جناب! یہ الفاظ امام حسینؑ نے کہاں کہے ہیں اور اس کا مدرک کیا ہے؟ امام حسینؑ نے یہ الفاظ کہے ہیں تو ان کا مدرک بھی ضرور ہوگا۔ لیکن جب وہ مدرک آپ کو نہیں ملے گا تو پھر آپ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے: جناب! یہ جملہ "اِنَّ الْحَيٰوةَ ....." کہاں سے آیا ہے؟ آپ مجھے بتائیں تاکہ میں مخالف کو جواب دے سکوں اور اسے اس کا مدرک دکھا سکوں۔ اس وقت میں آپ سے کہوں گا: جناب! اس کا

کوئی مدرک نہیں ہے تب آپ کہیں گے: جناب! آپ نے مجھے اب تک کیوں نہیں بتایا؟ کیا آپ یہ کہیں گے یا نہیں؟ اس وقت آپ میرے ہی جیسے ایک شخص پر اعتراض کرتے ہوئے کہیں گے: جناب! آپ نے ہمیں اب تک کیوں نہ بتایا؟ آپ نے خاموشی اختیار کی اور آج ہمیں دشمن کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا ہے۔ اگر آپ اس جملے کے جنگی پہلو EPIC پر فریفتہ ہیں تو امام حسینؑ نے کئی ایک ایسے جملے کہے ہیں جو اس جملے سے سوگنا بڑھ کر جنگی ہیں۔ "زندگی عقیدہ اور اس کے لیے جہاد ہے" کیا یہ بالاتر ہے یا یہ جملہ کہ "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے"۔

"ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے اور جہنم میں
جانے سے ذلت اٹھانا بہتر ہے"

کیا عقیدہ و جہاد کا جملہ بہتر ہے یا روز عاشور آپکا یہ جملہ زیادہ رفیع ہے:
"دیکھو! بدنہاد باپ کے بدنہاد بیٹے (ابن زیاد) نے مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ میں یا تلوار سونت لوں یا ذلت قبول کروں۔ مگر کہاں میں اور کہاں ذلت! خدا، اور رسولؐ کو ہم اہلبیت کی ذلت ہرگز منظور نہیں"
کیا اِنَّ نُحَیَتَۃ ... بہتر ہے یا وہ جملہ جو آپ نے خطبے میں فرمایا:

"جو ہمارے لیے جان قربان کرنے اور خدا سے ملنے کے لیے
تیار ہو وہ ہمارے ساتھ چلے، میں انشاء اللہ کل صبح روانہ
ہو رہا ہوں"

بیسیوں ایسے اور جملے بھی ہیں ـــــ ہمارے لیے رجزیات کی کوئی کمی

نہیں ہے۔ اگر ہم رجزیات کے معاملے میں نادار ہوتے یعنی ہمارے پاس رزمیہ جنگی نعرے نہ ہوتے کیا ہم، معاذ اللہ کہ ایک جملہ امام حسینؑ سے منسوب کر دیتے؟ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس اس قسم کے اتنے نعرے ہیں کہ دنیا چاہے تو ہم سے لے سکتی ہے۔ پھر ہم دوسروں کے نعروں کے پیچھے کیوں جائیں؟ اور وہ بھی ایسے نعروں کے پیچھے کہ جو درست بھی نہ ہوں۔ نوجوان نسل کے لیے مناسب نہیں کہ وہ تعصب سے کام لے۔ پس میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ امام حسینؑ کا نہیں اور مجھے ننانوے فی صد یقین ہے کہ نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کا مدرک ڈھونڈ نکالے تو میں قول دیتا ہوں کہ اسی منبر پر سے اعلان کروں گا کہ میری بات غلط تھی۔ لہٰذا ہمیں وہ بات کہنی چاہیے جس کی سند ہو، نہ وہ کہ جس کی کوئی سند ہی نہ ہو۔ اس ذیل میں بہت زیادہ مطالب ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ وقت کا دامن ان کے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

پس اس بنا پر نفس کے خلاف جنگ کرنے کے سلسلے میں ہمیں نفس کی عزت، شرافت اور کرامت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ہماری یہ گفتگو بجائے خود عرفان و تصوف کے مسلک پر ایک اور تنقید تھی۔ ہم نے اسے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا اور دیکھا کہ نفس کے خلاف جہاد کے مسئلے میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ اس میں نفس کی عزت اور کرامت بھی پامال ہو گئی ہے۔ جب ہم ان کے اس نظریے کو اسلام کے معیار پر جانچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہاں سے اس کی مخالفت ہونی چاہیے۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم
وصلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین۔

دسویں نشست

مختلف مکاتب فکر کے نظریات کی تفصیل[۴]

۱۴۶ اور ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا۔ پھر ان کو خدا کی راہ میں جو مصیبت پڑی اس پر نہ تو انہوں نے ہمت ہاری ـــ نہ بزدلی کی ـــ نہ دشمن کے آگے گڑگڑائے اور خدا تو ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۶)

کامل انسان، برتر انسان، مثالی انسان، بلند مرتبہ اور برگزیدہ انسان..... کے بارے میں جو مختلف مکاتب ہیں ان میں سے ایک ـــ مکتب قدرت ہے۔ اس مکتب کی نظر میں کامل انسان ـــ مقتدر اور صاحب قدرت انسان کے مساوی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس مکتب کے نزدیک کمال ـــ طاقت کے مساوی اور ـــ نقص ـــ عجز و ناتوانی کے مساوی ہے۔

یعنی انسانوں میں جو زیادہ طاقتور ہے وہ زیادہ کامل ہے اور جو زیادہ

کمزور ہے وہ زیادہ ناقص ہے۔ نیز حق و عدالت کی بنیادی طور پر کوئی حقیقت نہیں، اور قوت و طاقت کے بغیر ان کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

ہم عموماً اس طرح سوچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قطع نظر کہ یہ قوت فتح مند ہو یا وہ قوت ـ ان میں سے ایک حق و عدالت اور دوسری باطل اور ظلم ہے۔ اب ممکن ہے کہ ایک موقع پر حق ـ باطل کو شکست دے اور اس پر فتح پائے یا معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی باطل ـ حق پر فتح پائے۔ البتہ قرآن کی منطق کے مطابق آخری فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے اور باطل کی فتح وقتی ہوتی ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر کے مطابق یہ بات بے حد قابل توجہ ہے۔ لیکن اگر دو طاقتیں ایک دوسرے کے مقابل آجائیں اور ایک طاقت دوسری کو شکست دیدے تو یہ کہنا قرآن کے نظریے کے مطابق نہیں کہ فتح پانے والی طاقت ـ حق ہے اور جو شکست کھا جائے وہ باطل ہے۔

جو کام ایک طاقتور اور مقتدر شخص کرے اس وجہ سے کہ وہ شخص طاقتور ہے ـــ اس کا وہ کام عین عدالت ہے۔ یہ بھی ایک مکتب فکر ہے اور اس کی جڑیں سقراط سے قبل کے دور تک پہنچتی ہیں۔ سقراط ـــ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال پہلے گزرا اور اس وقت سے اب تک تقریباً ۲۴ سو سے ۲۵ سو سال گزر چکے ہیں۔ سقراط سے پہلے فلسفیوں کا ایک گروہ تھا جسے سوفسطائی کہا جاتا ہے اور وہ اجتماعی مسائل میں ایسا ہی نظریہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کا یہ نظریہ سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں کے ظہور سے خود یونان میں ہی منسوخ ہوگیا اور پھر مسیحیت آگئی جو کلی طور پر اس طرز فکر کے

برعکس ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ مسیحیت طاقت کی تبلیغ نہیں کرتی بلکہ وہ کمزوری کا پرچار کرتی ہے یعنی وہ کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو اور اس کے مقابل اپنا دفاع نہ کرو۔ یہ ایک طرح سے کمزوری کی تبلیغ ہے۔ لہٰذا مسیحیت کے فروغ اور ثانیاً اسلام کے ظہور کے باعث دنیا میں اس قسم کے خیالات یعنی سوفسطائیوں کے نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی۔

اگرچہ قدرت اور قوت کے بارے میں اسلام کی اپنی ایک خاص منطق ہے جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ وہ اس معاملے کو اس طرح پیش نہیں کرتا کہ قوت — حق و عدالت کے مساوی اور حق و عدالت —— قوت کے مساوی ہیں جب کہ خود اہل یورپ بھی کہتے ہیں کہ "طاقت حق ہے" MIGHT IS RIGHT یعنی حق ہی طاقت ہے۔

یوں ایک مرتبہ پھر سرزمین مغرب میں یہی خیال زندہ ہو گیا کہ حق —— طاقت کے مساوی ہے۔ پہلے پہل یہ خیال سیاست کے فلسفے میں ظاہر ہوا یعنی سیاست تک محدود رہا اور آگے نہیں بڑھا۔

اٹلی میں ایک عالم اور فلسفی گزرا ہے جس کا نام میکیاولی تھا۔ اس نے اپنے سیاسی فلسفے کی بنیاد اقتدار اعلیٰ پر رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سیاست میں جو واحد چیز ملحوظ خاطر رکھی جانی چاہیے وہ اقتدار ہی ہے۔ پس سیاست میں اس کے علاوہ کسی دوسرے اصول کے ذریعے سیاسی مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

جھوٹ، فریب، مکر، جھوٹی قسمیں، خیانت کرنا، حق سے روگردانی

وغیرہ جیسے مسائل کو سیاست میں زیر بحث نہیں لانا چاہیے۔ اس کے علاوہ کچھ اور فلسفی بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس نظریے کو فقط سیاست میں محدود نہیں کیا بلکہ اسے ایک عام اخلاقی اصول کے طور پر پیش کیا اور یہ استدلال و فلسفی حیثیت دیدی، یہاں تک کہ بنیادی طور پر وہ اس بات کے معتقد ہو گئے کہ اخلاق عامہ اور مکتب انسانیت کا اساس یہی میکیاولی کا نظریہ سیادت ہی ہے۔

نطشے — جرمنی کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے جو دنیا کے معروف فلسفیوں میں سے ہے اور اپنی زندگی کے آخری دور میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی طبیعت میں جنون کے آثار شروع ہی سے ظاہر تھے۔ یہ شخص بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے طاقت کو اخلاق کی بنیاد قرار دیا اور "طاقت" کو ایک عام اخلاقی اصول کے طور پر پیش کیا۔

یہاں ایک تمہید ضروری ہے اور وہ یہ کہ تقریباً چار صد سال پہلے یعنی سولہویں صدی عیسوی میں سائنس اور منطق میں ایک انقلاب رونما ہوا ہے۔ دنیا کے عظیم فلسفیوں میں سے ڈیکارٹ فرانسیسی اور بیکن برطانوی دو ایسے اشخاص ہیں جنہیں جدید علم و دانش کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کا اور خصوصاً بیکن کا —— علم کے بارے میں ایک نظریہ ہے۔ جس نے علم کے متعلق تمام گزشتہ نظریات کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ نظریہ جہاں علوم کی ترقی اور انسان کے فطرت پر غیر معمولی تسلط کا موجب قرار پایا ہے وہاں انسانوں کے فاسد اور گمراہ ہونے کا سبب بھی بنا ہے یعنی اسی نظریے نے انسان کو انسان کے ہاتھوں آزاد کیا اور اسی نے انسان کو خود انسان کے ہاتھوں برباد اور

فاسد کر دیا ہے وہ نظریہ کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے علم کے بارے میں بنی نوع انسان کے مربی اور وہ شخص فلاسفہ اور بالخصوص بانیان مذاہب نے علم کو قدرت اور طاقت کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی خاطر استعمال کیا تھا یعنی وہ بزرگ اور خصوصاً بانیان مذاہب انسان کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتے ہوئے اپنے کلمات میں جس چیز پر زور دیتے وہ یہ تھی: اے انسان! علم حاصل کر اور یہ جان لے کہ علم تجھے حقیقت تک پہنچائے گا۔ علم انسان کے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اسی بنا پر اس کو تقدس حاصل تھا اور اسے ایک مقدس حقیقت سمجھا جاتا تھا۔ علم انسان کی دنیاوی منفعتوں سے بلند اور مادی امور سے بلند تر تھا۔ چنانچہ علم کو ہمیشہ مال و دولت کے مقابلے پر رکھا جاتا تھا کہ آیا علم بہتر ہے یا مال؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی ادبیات میں یہ موازنہ کیا گیا اور علم کو دولت پر ترجیح دی گئی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

علم دادند بہ ادریس و بہ قارون زر و سیم
آن یکی زیر زمین و آن دگری فوق فلک

حضرت ادریسؑ کو علم دیا گیا اور وہ اس کی برکت سے آسمان پر پہنچ چکے ہیں، ادھر قارون کو سونا چاندی ملا اور وہ اس کی نحوست کے ساتھ زمین میں دھنس گیا تھا۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے بھی علم و مال کے درمیان موازنہ کیا اور علم کو مال پر ترجیح دی ہے۔ یعنی آپ علم کو ہمیشہ ایک مقدس چیز سمجھتے تھے اور اسے مادی امور اور مادی فوائد سے بلند تر گردانتے تھے۔

دے سکیں۔ علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ جس کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ یاد رکھو کہ علم حاکم ہوتا ہے اور مال محکوم!

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ کلام ۱۴۷ صفحہ ۵۰۰)

۲۔ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا مجھے اپنا غلام بنا لیا۔

آپ قرآن مجید کو بھی دیکھیں کہ اس نے علم اور اس کی تقدیس کو کس شان سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت آدمؑ کی خلقت، آپ کو سکھائے گئے اسماء کا علم کہ جس سے فرشتے بھی بے خبر تھے ـــــ اور فرشتوں کا انہیں سجدہ کرنا بھی ملاحظہ کریں:

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو سب کے سب جھک گئے۔ مگر شیطان نے انکار کیا، غرور میں آگیا اور کافر ہو گیا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۴)

یعنی اے ملائکہ! اے فرشتو! آدمؑ کو سجدہ کرو کیونکہ وہ وہ چیز جانتا ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔

لیکن کچھ وقت آگیا کہ جب بیکن اٹھا اور اس نے کہا: علم انسان کے لیے توانائی کا ذریعہ ہے ـــــ یہ کہنا کہ علم کے پیچھے اس لیے جائیں کہ ہم حقیقت کو دریافت کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت کا دریافت کرنا بجائے خود ایک مقدس چیز ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو چاہیے کہ علم کو زندگی کی خدمت پر لگا دے اور صحیح علم وہی ہے جو انسان کے کاروبار زندگی میں مددگار ثابت ہو۔

وہ انسان کو طاقت دے اور انسان کو فطرت پر مسلط کر دے۔

یہی وجہ ہوئی کہ علم نے اپنا آسمانی اور روحانی پہلو ——— زمینی اور مادی پہلو کے سپرد کر دیا۔ یعنی علم اور تحقیق کا راستہ بدل گیا اور ان کا رخ زیادہ سے زیادہ فطرت کے اسرار و رموز دریافت کرنے کی جانب مڑ گیا۔ کس لیے؟ اس لیے کہ انسان فطرت پر مسلط ہو جائے۔ چلیے وہ فطرت پر مسلط ہو گیا ——— تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بہتر طور پر زندگی بسر کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے لیے زیادہ سہولتیں فراہم کرے گا۔

ہاں تو اس نظریے نے ایک لحاظ سے بنی نوع انسان کی بہت بڑی عظیم خدمت انجام دی۔ کیونکہ علم اس کائنات کے اسرار و رموز دریافت کرنے کے راستے پر لگ گیا ——— تاکہ انسان فطرت پر تسلط حاصل کرے اور اس سے بہرہ مند ہو۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو علم نے یہ جو کچھ کیا، بہت اچھا کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی علم نے اپنی تقدیس اور اپنا اعلیٰ مقام کھو دیا ہے۔ اس وقت بھی علوم دینیہ کے جو طلبا ان تعلیمی مراکز میں قدیم معیارات کے مطابق تعلیم پا رہے ہیں ان کے نزدیک علم کی وہی قدر و قیمت ہے جو مستند کتاب آداب المتعلمین اور کتاب منیۃ المرید میں بیان کی گئی ہے۔ ان کتابوں میں روایات، احادیث اور ایسی چیزیں موجود ہیں جن کے مطابق علم ایک مقدس اور پاکیزہ چیز ہے۔ ان روایات و احادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ جب ہم کسی علمی مرکز میں سبق لینے جائیں تو ہمیں وضو کر کے اور پاک ہو کر جانا اور تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ وہاں کے استاد اور معلم طلبا کے نزدیک ایک خاص احترام اور جلال کے حامل ہیں۔ انہیں ایک خاص تقدس حاصل ہے اور وہ طلبا واقعی

دل کی گہرائیوں سے استاد کا ادب کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دولت کی خاطر علم حاصل کرنا چاہے تو اسے اپنے دل میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اس لیے علم حاصل کرتا ہوں تاکہ آئندہ اس سے مال و دولت کماؤں یا اگر معلم طلبا کو تعلیم دینا چاہے اور اس کا مقصد تعلیم کے بدلے میں دولت حاصل کرنا ہو تو وہ اسے علم کے مقام سے گراوٹ سمجھتا ہے۔ لیکن جدید نظام تعلیم جو بیکن وغیرہ کی بتائی ہوئی ڈگر پر چل رہا ہے اس میں تعلیم و تعلم کا عمل اپنا تقدس مکمل طور پر کھو چکا ہے۔ ایک طالب علم جب علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک یہ آئندہ زندگی میں دولت کمانے کی تیاری کا عمل ہوتا ہے۔ اس روش کے مطابق اگر ایک شخص سکول یا یونیورسٹی میں جاتا ہے تاکہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بن جائے اور بہتر زندگی کا سامان فراہم کرے یا ایک شخص بازار میں جاتا ہے تاکہ ایک تجارتی کاروبار کر کے دولت کمانے کے قابل ہو جائے تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں ہی روپے پیسے کے پیچھے جاتا ہے اور یہ بھی روپے پیسے کے پیچھے جاتا ہے۔ وہ شخص معلم کے بارے میں بھی کچھ اس انداز سے سوچتا ہے کہ یہ صاحب ہمیں پڑھانے کی ہماری فیس لیتے ہیں اور فیس کی ادائیگی کے بارے میں ان سے یہ معاف کیے بھی چاہتے ہیں۔ جیسا کہ عملی طور پر بھی ہم دیکھتے ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ ایک شاگرد بیٹھے بیٹھے اپنے استاد کو چند گالیاں دینے میں کوئی شرم محسوس نہ کرے اور اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

لیکن گیا اور اس نے کہا: علم طاقت کے لیے ہے ——— علم اس لیے ہے کہ طاقت کی خدمت کرے ——— دانائی صرف توانائی کے لیے ہے کسی

اور چیز کے لیے نہیں۔ ابتدا میں تو اس نظریے کے بُرے اثرات ظاہر نہیں ہوئے لیکن بتدریج جب انسان علم سے فقط طاقت چاہنے لگا تو نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ہر چیز قدرت اور طاقت کی خدمت میں لگ گئی۔ اس وقت دنیا کا پہیہ اسی محور پر گھوم رہا ہے کہ علم مکمل طور پر طاقتوں کی خدمت میں لگا ہے۔ دنیا میں علم کبھی بھی اتنا قیدی نہیں بنا اور طاقتوں کی خدمت میں نہیں جتا رہا جتنا آج ہے یعنی دنیا کے صاحبانِ علم طاقتوں کے قیدی ہیں۔ مثلاً آئن سٹائن کو لیجیے اس کا علم کس کی خدمت میں ہے۔ وہ روزویلٹ کی خدمت میں ہے۔ یعنی آئن سٹائن ـــــ روزویلٹ کا خادم بن گیا ہے اور یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ خادم بنے یا نہ بنے۔ علما امپیریلزم کے کیمپ میں ہوں یا سوشلزم کے کیمپ میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس وقت وہ ہر جگہ طاقت کی خدمت میں مصروف ہے۔ یہ علم نہیں بلکہ طاقت ہے جو اس دنیا پر حکم چلا رہی ہے۔ اس لیے "آجکل ہمارا یہ کہنا کہ ہماری دنیا علم کی دنیا ہے" ہمیں اس بات میں تھوڑی سی تصحیح کرلینی چاہیے۔

ہماری دنیا علم کی نہیں بلکہ طاقت کی دنیا ہے۔ یعنی علم ہے لیکن آزاد نہیں ـــــ یہ علم "طاقت" اور جبر کی خدمت میں مصروف ہے۔ لہٰذا دنیا میں جو اختراع یا انکشاف ہوتا ہے اسے طاقت کی خدمت پر لگا دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کو قتل کرنے کے لیے خطرناک اسلحہ تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی علم پہلے وہاں جاتا ہے اور پھر کچھ بچ جائے تو انسان کے دوسرے کاموں کی خدمت میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انکشاف بھی ہوتا ہے سوائے اس کے جو اس کے کام کا نہ ہو وہ طاقت کی خدمت میں ہی جاتا ہے۔

اور وہ طاقت کے کام کا ہو تو پہلے اسے وہیں لے جایا جاتا ہے اور جب تک ضرورت ہو اسے وہیں رکھا جاتا ہے کیونکہ طاقت کو اس کی حاجت ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں ضرورت سے زائد ہو جاتا ہے تو پھر اسے زندگی کے دوسرے شعبوں کی خدمت میں بھیج دیا جاتا ہے۔

جو راستہ بیکن نے اختیار کیا ہے وہ لازمی طور پر اس راستے سے ملتا ہے جو نطشے اور میکیاولی نے ـــــ بالخصوص جو کچھ نطشے نے بتایا تھا۔

ایک اور نظریہ بھی دنیا میں پیدا ہوا اور وہ نطشے کے لیے ایک اور سہارا بن گیا ـــــ وہ ڈارون ازم کے اصولوں میں سے ایک اصول تھا۔

خود ڈارون ذاتی طور پر ایک متدین عیسائی تھا اور وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو خدا کا مخالف ہو۔ وہ ایک مذہبی آدمی اور مخلص عیسائی تھا۔ اس کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جاں کنی کے عالم میں اس نے عیسیٰ مسیح کی مقدس کتاب اپنی چھاتی پر رکھی ہوئی تھی اور اسے بھینچ رکھا تھا۔ وہ خود بھی اپنی کتاب کے مقدمے میں خدا کے وجود کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے مسیح علیہ السلام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا میں ڈارون کے اصولوں سے بڑا غلط فائدہ اٹھایا گیا اور شاید وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو ـــــ مگر ہو گیا۔

مادہ پرستوں نے ڈارون کے اصول ارتقا کو خدا کی ہستی سے انکار کا ذریعہ قرار دیا اور یہ بجائے خود ایک داستان ہے۔ فلسفے سے ایک اور غلط فائدہ اخلاق یعنی ایک مثالی، برتر اور کامل انسان کی تعمیر کے بارے میں اٹھایا گیا کیونکہ اس کا ایک اصول "تنازع بقا" یعنی بقا کی جنگ کی عام جنگ تھی۔

ڈارون نے جن چار اصولوں کی بنیاد رکھی ان میں سے ایک "حبِّ ذات" ہے۔ یعنی ہر حیوان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا "تنازع بقا" کا اصول ہے یعنی اس نے کہا کہ اس دنیا میں زندگی کی بنیاد تنازع للبقا پر ہے۔ جاندار ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہیں اور جو زیادہ طاقتور ہے وہ باقی رہتا ہے۔

انہیں فطرت کی کھیتی میں پھینکا جاتا ہے۔ یہ جنگ فطرت کی کھیتی ہے، اور اس میں مسلسل چلا جاتا ہے۔ اس جنگ میں جو حیوانات ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں اور فطرت ان کو چھانٹتی ہے ان میں سے جو بہتر ہو اسے بقا کے لیے چن لیتی ہے۔ یعنی اس کو جس نے جنگ میں اپنی بہتر حفاظت کی ہو اور حریف کو ختم کر دیا ہو۔

اب ڈارون کے اس اصول پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ موجودات باقی رہتے ہیں لیکن اس کی وجہ بقا کے لیے قوی یا بہتر ہونا نہیں ہے۔ اس کے باوجود نطشے نے اس اصول سے نتیجہ اخذ کیا اور کہا ہے کہ تمام موجودات حتیٰ کہ انسان میں بھی تنازع بقا زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ وہ انسان جو زیادہ طاقتور ہو باقی رہتا ہے اور اسے باقی رہنا بھی چاہیے۔ پھر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ فطرت برتر انسان کی جانب سفر کرتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس سے ہم "کامل انسان" مراد لیتے ہیں۔ تاہم وہ کہتا ہے: برتر انسان ــــ سپرمین SUPERMAN اور کامل انسان کو کسی نہ کسی وقت معرض وجود میں آنا چاہیے۔

ہم اس سے سوال کرتے ہیں: کامل انسان سے کیا مراد ہے؟

وہ کہتا ہے: زیادہ طاقتور انسان اور ایسا انسان جس میں ضعیف پرور اخلاق ہرگز موجود نہ ہوں۔

اس کی نظر میں ضعیف پرور اخلاق کون سے ہیں؟ یہ وہی ہیں جنہیں ہم محبت کرنا، مہربانی کرنا، احسان کرنا اور خدمت خلق کرنا کہتے ہیں۔

وہ مزید کہتا ہے کہ یہ اخلاق نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے ابوالبشر کو بلندی سے زمین کی پستی میں پہنچایا۔ یہی ہیں جو انسان کے ارتقا میں مانع ہیں اور یہی ہیں جو برتر انسان "طاقتور انسان" اور زیادہ کامل انسان کے ظاہر ہونے میں مانع ہیں۔ کامل انسان وہی ہے جس میں کمزوری کی علامتیں اور وہ چیزیں جنہیں ہم کمال شمار کرتے ہیں ــــ موجود نہ ہوں۔ لہٰذا وہ سقراط کا بھی دشمن ہے، اور مسیح کا بھی دشمن ہے۔

وہ کہتا ہے: سقراط نے اپنے اصول اخلاق میں عفت، پاکیزگی، عدالت اور مہربانی وغیرہ کی تعلیم دی تو اس نے بہت برا کیا۔ بلکہ اس کے نظریے کے مطابق سقراط سے بھی بدتر حضرت عیسیٰؑ ہیں جنہوں نے محبت اور مہربانی کے ضمن میں یہ سب کچھ کہا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری کے نقاط ہیں اور انسان ان سے جس قدر دوری کرتا ہو اتنا ہی کمال کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ کیونکہ کمال کے معنی توانائی اور نقص کے معنی ناتوانی کے ہیں اور یہ چیزیں نقص سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اصل بات صحیح راستے سے کہاں تک ہٹ گئی ہے۔

زیادہ وضاحت کی خاطر ہم ان کے کچھ اقوال بیان کرتے ہیں جو تاریخ فلسفہ کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئے ہیں۔ میں نے فروغی کو دوسروں سے بہتر

دیا ہے۔ اس ضمن میں آپ کی خاطر وہ اقوال پیش کرتا ہوں جو فرائڈ نے نقل کیے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "سہ حکمت در اردویا" میں کہتا ہے:

"دنیا کے تمام اہلِ دانش نے خود پرستی کو برا اور دوسروں سے شفقت کو اچھا سمجھا اور نفس کی کمزوری اور عیب گردانا ہے۔ چونکہ مسئلہ محض طبیعت کا ہے ہمیں چاہیے کہ اس بارے میں گفتگو کرنی چاہیے کہ آیا شفقت اور مہربانی نفس کی کمزوری ہے یا نہیں؟ اس نے شوپنہاور کے اس عقیدے کی تصدیق کی ہے کہ دنیا میں بنیادی چیز زندگی کی خواہش ہے لیکن اس کے اس جیسا کی تفسیر کی ہے کہ زندگی کی خواہش مرکزی چیز ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ روح ــــ زندگی کا طالب ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے زندگی کی طلب حاصل ہے اور زندگی کی خواہش درحقیقت طاقت کی خواہش ہے۔

ڈارون کی آراء میں سے نطشے نے تنازع کی کوشش کو قبول کر لیا ہے اور اسے تنازع کے معنوں میں لیا ہے۔ گویا جس چیز کو دوسروں نے ڈارون کی خصوصیت کا نتیجہ سمجھا اس نے … دیا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش کی حالت میں ہوں، طاقت حاصل کریں اور دوسروں پر غالب آئیں۔

عام فطرت کے بیشتر خیر خواہوں نے اکثریت کے حالات کی رعایت کو واجب شمار کیا اور کہا ہے کہ دنیا کے امور کا دارومدار عوام کی اچھی حالت پر ہے۔ اس کے برعکس نطشے نے اکثریت کو ذلیل سمجھا ہے اور فقط اقلیت جیسی خوشی کو خوشحالی کا مقصد شمار کیا ہے۔ نطشے کی سوچ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ طاقتور ہو اور اس کی زندگی از حد خوش اور پرمسرت ہو۔ نیز

اس کا نفس زیادہ شگفتہ اور زیادہ طاقتور ہو۔ نیز اس کا نفس میلانات اور عادات سے جدا پڑا ہو۔

اس بارے میں بحث بیکار ہے کہ دنیا کی زندگی اچھی ہے یا بری ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی شخص بھی اس کا پتہ نہیں چلا سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں بہتر ہوتا کہ ہم دنیا میں آتے ہی نہ ہوتے۔ مجھے علم نہیں شاید ایسا ہی ہو لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہ اچھا ہو یا برا ہو بہرطور میں اس دنیا میں آ گیا ہوں اور اس کی اچھائی برائی کو نہیں جانتا۔ پھر بھی مجھے اس دنیا سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور جتنا زیادہ لطف اندوز ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ سوچنے کا ڈھنگ اندر سے جو معاملہ یہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ہم دنیا کی نعمتوں کے مزے لوٹتے رہے اور لوٹتے رہیں گے جو چیز اس مقصد کے حصول میں کارآمد ہو وہ اچھی ہے ــــ خواہ وہ سنگدلی، بے رحمی، مکر، فریب اور ظلم و جبر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر جو چیز اس مقصد میں رکاوٹ ہو وہ اس کے خلاف ہو وہ بری ہے ــــ خواہ وہ سچائی، مہربانی، فضیلت اور تقویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بات غلط ہے اور عام انسانیت کی ترقی کے منافی ہے کہ لوگ یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ اس کی بجائے لوگوں کے دو گروہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زبردست اور آقا ہوں ــــ دوسرے وہ جو ماتحت اور غلام ہوں۔ شرافت اور بڑائی زبردست لوگوں کا حق ہے کہ وہی اس دنیا کے وجود میں آنے کا مقصد ہیں اور کمزور لوگ محض ان کی غرض پوری کرنے کا ذریعہ ہیں۔ دنیا کی ترقی اور زندگی کی بقا بھی بڑے اور زبردست لوگوں کی بدولت وجود میں آتی ہے جو محدود تعداد میں ہیں اور اکثریت کو چاہیے کہ ان

کے کاروبار کی ترقی کا وسیلہ ہے۔ انسانی معاشرہ کی تعریف طاقتور طبقے کے کاروبار کی ترقی کے لیے تشکیل دیا گیا ہے اور جب کہ خیال کیا جاتا ہے معاشرہ کی یہ نہیں ہے کہ ـــــ زیردستوں کی حفاظت و پرورش کریں، بلکہ زبردست اور طاقتور لوگ جو ترقی ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ پرورش ہونی چاہیے۔ تاکہ ان میں سے برتر آدمی وجود میں آئیں اور انسان ترقی و عروج کے مدارج میں قدم رکھے۔ حکومت و معاشرہ اس لیے ہیں کہ طاقتور لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ کمزور لوگ چوپایوں کا حکم رکھتے ہیں جنہیں طاقتور لوگوں کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔" (سیر حکمت در اروپا حصہ سوم صفحہ ۹۰)

ادھر سعدی شیرازی کہتے ہیں:

گوسفند از برای چوپان نیست
بلکہ چوپان برای خدمت اوست

بھیڑ بکری چرواہے کے لیے نہیں، بلکہ چرواہا بھیڑوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ہے۔

لیکن مکتب قدرت کہتا ہے کہ درحقیقت بھیڑ بکری گڈریے کے لیے ہے یعنی زبردست و طاقتور لوگ جو چرواہا اور آقا ہیں انہی کو پھولنا پھلنا چاہیے تاکہ ان میں سے برتر اشخاص وجود میں آئیں اور انسان ارتقاء و عروج کے مدارج طے کرے۔ خود مغرب کے اہل دانش میں بھی نسل انسانی کی اصلاح اور بہبود کے بارے میں ایک بحث پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں الیکسس کارل نے اپنی کتاب "انسان موجود ناشناختہ" کے آخر میں اسی اصول کو اختیار کیا اور کہا ہے کہ نسلوں کی اصلاح ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کا نظریہ تو یہ ہے کہ

کمزور انسانوں کو سرے سے تولید نسل کا حق ہی نہیں دیا جانا چاہیے۔

وہ کہتا ہے کہ اب تک جن اخلاقی اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں وہ عام لوگوں یعنی نچلے طبقے یعنی زیردستوں کے مفاد کی خاطر ترتیب دیے گئے ہیں اور زبردستوں و طاقتور طبقے کے فائدے کے لیے نہیں ہیں۔ لہذا ان اصولوں کو ختم کر دینا چاہیے اور ایسے اصول اختیار کرنے چاہئیں جو ترقی پسند و طاقتور لوگوں کے مفاد میں ہوں۔ نیکی، سچائی اور احسان کوئی حقیقی امور نہیں ہیں۔ ہاں جو چیز حقیقت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص طاقت کا بھوکا ہے۔

مذہب نے بنی نوع انسان کو دھوکا دیا اور ان کو عدالت کے مفہوم اور زیردستوں کی حمایت کرنے کی دعوت دی ہے۔ مذاہب سے پہلے کے ادوار پیچھے تھے کہ جب دنیا میں جنگل کا قانون جاری تھا اور جو زیادہ طاقتور ہوتا تھا وہ کمزور کو کھا جاتا تھا اور کمزور نسل معدوم ہوتی چلی جاتی تھی۔ پس صدی کے دور میں دنیا طاقتور لوگوں کی مرضی کے محور پر گھومتی تھی اور کمزور ان کے ماتحت اور غلام تھے۔ تاہم طاقتور تھوڑے اور کمزور بہت زیادہ تعداد میں تھے اس لیے انہوں نے حیلے، تدبیر اور دھوکے سے کام لے کر ان طاقتور لوگوں کو اپنی ترقی کا وسیلہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے مہربانی و شفقت، دوستی و خیر خواہی، عدالت و کرامت کے اصول کو نیکی، راستی اور احسان کی شکل میں ان کے سامنے جلوہ گر کیا اور قبول کرایا۔ تاکہ اس طریقے سے وہ طاقتور لوگوں کی طاقت کو معطل بنا دیں اور ان کی غلامی سے نجات پائیں۔ انہوں نے اپنے اس مقصد کو مذہب کے وسیلے سے حاصل کیا اور خدا کے نام اور حق کو ان مذہب کا مضبوط بنیادگاہ قرار دیا۔

تاہم منتخب قدرت کے حامیوں کا یہ نظریہ کارل مارکس کے نظریے سے بالکل برعکس ہے جو کہتا ہے کہ مذہب کو طاقتور لوگوں نے کمزور لوگوں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختراع کیا ہے جبکہ نطشے کہتا ہے کہ مذہب کو کمزوروں نے طاقتوروں کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر اختراع کیا ہے۔ اگرچہ دونوں ہی مذہب کے مخالف ہیں لیکن ایک کا دعویٰ ہے کہ مذہب کمزوروں نے اختراع کیا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو طاقتوروں کا طرفدار سمجھتا ہے مگر دوسرا جو اپنے آپ کو کمزوروں کے طرفدار کے طور پر پیش کرتا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ مذہب کو طاقتوروں نے اختراع کیا ہے تاکہ کمزوروں کی توجہ [illegible] پر قابو پا سکیں اور پھر وہ سقراط اور مسیح پر اعتراض کرتا ہے

وہ کہتا ہے: مسیحی اخلاق غلامی کا اخلاق ہے اور اس نے آقائی کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ انسانی برادری، برابری اور صلح جوئی —— نیز عورتوں اور مزدوروں کے حقوق کی رعایت اور ایسی ہی دوسری باتیں جو آجکل کہی جا رہی ہیں ان کا ماخذ مذہب ہے جو دھوکے، فریب اور کمزوری اور اضمحلال کا موجب ہے۔ ان اصولوں کو ترک کر دینا چاہیے اور طاقت کی زندگی کے اصول اختیار کرنے چاہییں۔ خدا اور آخرت کی زندگی کا ذکر نہیں کرنا چاہیے اور مہربانی اور رقت قلب کو دل سے نکال پھینکنا چاہیے۔

مہربانی کی بنیاد بے بسی پر ہے اور فروتنی دراصل کمزوری —— اور بزدلی سے پیدا ہوتی ہے، نیز حلم و حوصلہ اور عفو و چشم پوشی —— بے ہمتی اور سستی کا نتیجہ ہیں۔ اس کی بجائے انسان کو مردانگی اختیار کرنی چاہیے تاکہ وہ "برتر مرد" کے رتبے پر پہنچے۔ برتر مرد وہ ہے جو اچھائی اور برائی سے

برتر ہو اور قوت و قدرت حاصل کرنے کا عزم و ارادہ رکھتا ہو۔

اہل یورپ کے درمیان ایسے بہت سے مکاتب پیدا ہوئے۔ مگر خوش قسمتی سے ہمارے درمیان ایسے مکاتب اور ایسی دبائیں پیدا نہیں ہوئیں۔ چنانچہ یورپی روح یہی ہے —— وہ حقوق انسانی کا جو علم اٹھائے ہیں وہ بھی محض دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے ہے۔ یورپی تربیت درحقیقت یورپی اخلاق، میکیاولی کا اخلاق اور نطشے کا اخلاق ہے۔ آج مادی استعمار دنیا میں جو کام انجام دے رہا ہے وہ اسی بنیاد پر ہے اور دنیائے استعمار کی روح خواہ وہ امریکی ہو یا یورپی —— یہی ہے اور اس کا اخلاق بھی یہی ہے۔

جب وہ ہمارے سامنے آتے ہیں تو حقوق انسانی کا دم بھرتے ہیں اور ہم ایسے بدبخت ہیں کہ ان کی باتیں باور کر لیتے اور جگالی کرتے رہتے ہیں۔ خود ان کی قسم! یہ غلطی ہے اور بہت بڑی غلطی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ امریکہ نے ویتنام میں کیا کیا؟ کیا اس نے نطشے کے فلسفے پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ اور کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو نطشے ہی کا فلسفہ ہے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسل نے یہ کہا اور سارتر نے یہ کہا، مگر وہ بھی اسی کے ہم نظر ہیں اور تمام مغربیوں کی سوچ کی بنیاد یہی ہے۔ بہت کم افراد ایسے ہوں گے جنہیں مستثنیٰ قرار دیا جا سکے اور جو اس انداز پر نہ سوچتے ہوں۔ ان کا خون بھی شاید سرزمین مشرق سے ہو گا یا ان کی ماں یا دادا یہاں سے گزری ہوں گی [illegible] ورنہ ان سب کا تخم اور ضمیر انسانی ہے۔

نطشے کہتا ہے: "عشق کیوں کیا جائے؟" اس کی بجائے عشق کو

پامال کر دینا چاہیے۔ دوسروں کی خدمت کیا چیز ہے؟ اس کی بجائے انسان کو چاہیے
کہ اپنے آپ کو چاہے اور اپنے آپ کو پوجے۔ نیز کمزور اور ناتواں لوگوں کو بے
سہارا چھوڑ دینا چاہیے ___ برتر مرد وہ ہے جو طاقتور ہو اور طاقت کے ساتھ
زندگی بسر کرے، اپنی خواہشات کو پورا کرے اور خوش رہے، اپنے آپ کو تنہا
مالک سمجھے، اس کی ترقی کی راہ میں جو بھی رکاوٹ درپیش ہو اسے ہٹائے،
خطرے سے ہراساں نہ ہو اور جنگ سے نہ ڈرے۔

پھر وہ عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"عورت کی مرد سے برابری اور اس کے حقوق کی رعایت کا لازم ہونا
بھی ایک غلط بات ہے۔ اصل چیز مرد ہے اور مرد کو چاہیے کہ جنگجو ہو ___
عورت کا کام جنگجوؤں کو تفریح مہیا کرنا اور بچے پیدا کرنا ہے۔"

پس ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کامل انسان یعنی مثالی اور اعلیٰ انسان
کو متعارف کرانے کا یہ بھی ایک معیار ہے جو مکتب قدرت کی طرف سے پیش
کیا جاتا ہے۔

اس کے مقابلے پر ایک اور مکتب ہے جو کمزوری کا پرچار کرتا ہے اور
وہ بھی اور توانائی کو کمزوری میں منحصر سمجھتا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں
اور مکتب بھی موجود ہیں۔ یہ اعتراض خصوصاً مسیحیت پر وارد ہوتا ہے کہ اس
نے کمزوری پر مبنی اخلاق کا بہت زیادہ پرچار کیا ہے۔ یہی بات کہ اگر کوئی
تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی پیش کر دو ___
کمزوری کی تبلیغ ہے۔

اس معاملے میں اسلام کی منطق کیا ہے؟ کیا اسلام نے ان دونوں

میں طاقت کا پرچار کیا ہے یا کمزوری کا یا نہ طاقت کا اور نہ کمزوری کا؟ ہاں
اس نے ایک اور لحاظ سے طاقت کا پرچار کیا ہے لیکن ایسی طاقت کا جو
شیطنت کی طاقت نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی طاقت ہے جس سے انسانیت
کی صفات ابھرتی ہیں۔ ایک ایسی طاقت کہ جس سے مہربانی ابھرتی ہے،
جود ابھرتا ہے، شفقت ابھرتی ہے اور احسان ابھرتا ہے۔

اسلام میں طاقت اور توانائی کی دعوت دی گئی ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید
اور روایات میں طاقت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور کچھ لوگ جنہوں نے
اسلام کا مطالعہ کیا ہے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی دین نے اپنے پیروؤں کو
طاقت اور توانائی کی جانب اتنی دعوت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے۔

تاریخ تمدن کی گیارھویں جلد جو تمدن اسلام سے مخصوص ہے اس
میں ول ڈورینٹ نے ایک جملہ کہا ہے: "کسی دین نے لوگوں کو طاقت اور
قوت کی جانب اس قدر دعوت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے۔" اس سلسلے
میں بہت سے مطالب ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضرت یحییٰ سے
خطاب کیا گیا ہے:

"اے (ہم نے کہا،) اے یحییٰ! کتاب توریت کو قوت کے ساتھ
تھام لو۔" (سورۂ مریم۔ آیت ۱۲)

آپ ایک اور جگہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کس جرأت کے ساتھ فرماتا
ہے:

[illegible] سے [illegible] رکھتے ہیں جن کے ساتھ ہو کر [illegible]
[illegible] نے جہاد کیا [illegible]

لڑائی میں پیٹھ تو انہوں نے ہمت ہاری — نہ بودا پن دکھایا — نہ دشمن کے آگے گڑگڑائے اور خدا تو ثابت قدم رہنے والوں سے الفت رکھتا ہے۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۴۶)

یعنی خدا فرماتا ہے کہ مومنین باہمت ہوتے ہیں اور وہ کمزوری و بزدلی کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتے۔

بے شک خدا تو ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اُس کی راہ میں یوں پرا باندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (سورۂ صف۔ آیت ۴)

یعنی مومنین لڑتے ثابت قدم ہوتے ہیں اور کوئی طاقت انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتی۔

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔
(سورۂ فتح۔ آیت ۲۹)

قرآن میں ایسی ہی اور بھی آیات ہیں جن میں شجاعت کو اسلام کی ایک قابل ستائش حقیقت کہا گیا ہے۔ عزت یعنی اونچا مقام رکھنا اور طاقت کا اس حد تک ہونا کہ انسان کو کوئی بھی دوسرا شخص ذلیل و خوار نہ کر سکے — اسلام میں ایک ممدوح چیز ہے۔

قرآن مجید دشمن سے مقابلے کے بارے میں فرماتا ہے:

اے (مسلمانو) ان کفار کے مقابل جہاں تک ہو سکے زور بازو

اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے سامان مہیا کرو۔ اس سے تم خدا کے اور اپنے دشمن پر دھاک بٹھا لوگے۔
(سورۂ انفال۔ آیت ۶۰)

دشمن کے مقابلے میں جتنی قوت ہو سکے بہم پہنچاؤ تاکہ وہ تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

قرآن یہ بھی فرماتا ہے:

اور جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو۔ خدا زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۹۰)

یعنی دشمن سے لڑتے ہوئے بھی حق اور عدالت کو فراموش نہ کرو۔ جب دشمن سے لڑو تو جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک دشمن سے جاری رکھے۔ اگر دشمن اطاعت قبول کرے اور ہتھیار ڈال دے تو تم بھی ہتھیار استعمال نہ کرو کیونکہ یہ بھی زیادتی اور تجاوز ہے۔ بوڑھوں کو مت قتل کرو، بچوں کو مت قتل کرو، عورتوں کو مت قتل کرو اور ان سے معترض نہ ہو۔ جو لوگ میدان جنگ سے چلے جائیں انہیں جانے دو اور جو شخص تم سے جنگ کرے صرف اس کے ساتھ پوری قوت سے جنگ کرو۔

یہ ان احکام کا ایک سلسلہ ہے جو قرآن مجید میں ہیں۔ کیونکہ اس طرز کی اور آیات بھی ہیں۔ اب ہم نمونے کے طور پر چند حدیثوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اسلام نے کس طرح بزدلی، خوف اور کمزوری کی مذمت اور قوت و طاقت کی تعریف کی ہے۔ لیکن جس قوت اور

طاقت کی سلام تعریف کرتا ہے وہ نطشے کے فلسفے سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی ——— کل رات میں اس کی مزید توضیح کروں گا۔

رسول کریمؐ نے فرمایا:

"مومن کے لیے دو چیزیں مناسب نہیں ہیں ——— یعنی کنجوسی اور بزدلی۔" (جامع السعادات جلد ۲ صفحہ ۱۱۰)

ان کی مختصر تشریح یہ ہے:

ا۔ بخل اور وہ یہ ہے کہ روپیہ پیسہ اپنی جان سے عزیز تر رکھے۔

ب۔ خوف اور بزدلی، مومن بزدل نہیں ——— وہ بہادر اور طاقتور ہوتا ہے۔

رسول اکرمؐ اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں:

"اے پروردگار! میں دو چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور وہ ہیں کنجوسی اور بزدلی۔" (جامع السعادات جلد ۲ صفحہ ۱۱۰)

امام علی علیہ السلام مومن کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مومن کا نفس پتھر سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔"

(نہج البلاغہ، حکمت ۳۳۳، صفحہ ۹۱۵)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"خدا نے ہر چیز میں اختیار مومن کو دیا ہے سوائے ایک چیز کے جس کا اختیار اسے نہیں دیا گیا اور وہ ہے خوار و ذلیل ہونا کیونکہ مومن ہمیشہ عزیز ہوتا ہے اور وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا۔ ہاں! مومن پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط [illegible] اور

زیادہ معزز ہوتا ہے کیونکہ پہاڑ کو ایک کدال سے کھودا جا سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کے دین میں سے کوئی چیز توڑی جا سکے۔" (سفینۃ البحار، مادۂ قرض)

یعنی یہ ناممکن ہے کہ مومن کے دین و ایمان کی روح کا ایک بھی ٹکڑا کسی کدال سے کاٹا جائے، تنگ کیا جائے، اور اسے ریزہ ریزہ کیا جائے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: خدائے تعالیٰ نے مومن کو تین خصلتیں دی ہیں:

(۱) ——— دنیا اور آخرت میں عزت

(۲) ——— دنیا اور آخرت میں نجات

(۳) ——— ظالموں کے سینے میں ہیبت

(المواعظ العددیہ صفحہ ۱۰۳)

یعنی مومن کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ظالم اپنے دل میں اس کی ہیبت اور خوف محسوس کرتا ہے۔ نیز ہمیں غیرت کے بارے میں بھی کچھ روایات ملتی ہیں کیونکہ غیرت بجائے خود ایک طاقت ہے اور بے غیرتی ایک قسم کی کمزوری ہے۔

رسول کریمؐ نے فرمایا: ابراہیمؑ پیغمبر غیور تھے اور میں ان سے زیادہ غیور ہوں۔ جو شخص مومنوں اور مسلمانوں کے بارے میں باغیرت نہ ہو خدا اس کی ناک کاٹ دیتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ سعد غیور ہے ——— میں اس سے زیادہ غیور ہوں اور میرا خدا بھی غیور ہے۔ اس موضوع پر بھی ہمارے پاس اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔

اقبال پاکستانی نے ایک جملہ کہا اور یہ جملہ بڑا عمدہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسولینی کے جواب میں کہا گیا ہے۔

مسولینی کہتا ہے: جس کے پاس لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے پاس روٹی ہو تو تیرے پاس لوہا (طاقت اور اسلحہ) رکھ۔

اقبال نے کہا: جو بذات خود لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

یعنی مسولینی اسلحہ پر بھروسا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس کے پاس مادی قوت ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

لیکن اقبال روح پر تکیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص خود لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔

امیر المومنین ؑ نے فرمایا:

مومن کا نفس پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔

ان جملوں کا مقصد اور مفہوم ایک ہی ہے

بہرحال اسلام قوت اور طاقت کی دعوت دیتا ہے اور ہم نہج البلاغہ میں دیکھتے ہیں کہ امیرالمومنین ؑ نے طاقت اور قوت کی کس قدر دعوت دی ہے اور کمزوری کو اس کے لیے قطعاً مناسب نہیں کہا۔ آپ فرماتے ہیں:

۵۲؎ خدا کی قسم! جن افراد قوم پر ان کے گھروں کے حدود کے اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۷ صفحہ ۱۵۳)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

۳۲؎ ذلیل آدمی ذلت آمیز زیادتیوں کی روک تھام نہیں

کر سکتا اور حق بغیر کوشش کے نہیں ملا کرتا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین خطبہ ۲۹ صفحہ ۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ کمزور آدمی ظلم کو کبھی نہیں روک سکتا اور سعی و کوشش کے بغیر حق ہرگز حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اہل مغرب ایک جملہ کہتے ہیں: "حق لینے کی چیز ہے" یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ آیا حق لینے کی چیز ہے یا دینے کی چیز ہے؟ یعنی کیا حق ایک ایسی چیز ہے جو انسان اپنی خوشی سے حقداروں کو دے دیتے ہیں یا ایک ایسی چیز ہے جو حقداروں کو خود لینی چاہیے؟ بعض مکتب کہتے ہیں کہ حق دینے کی چیز ہے یعنی جس شخص نے لیا ہوا ہے چاہیے کہ وہ واپس کرے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایسا کرے۔ بہرحال حق دینے کی چیز ہے لینے کی نہیں۔

مسیحیت اس بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حق تمہیں ملنا چاہیے ہم سفارش کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ حق تمہیں دے دیا جائے۔ لیکن تمہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ مسالمت اور رضا کے خلاف ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ حق دینے کی چیز ہے۔ مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حق فقط لینے کی چیز ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ جس شخص نے حق مار لیا ہو وہ دوبارہ آئے اور اسے واپس کر دے؟

اسلام کے نقطہ نگاہ کے مطابق "حق لینے کی چیز بھی ہے اور دینے کی چیز بھی ہے" یعنی حق حاصل کرنے کے لیے دوسروں پر جنگ کرنی چاہیے مگر اسلام کے مکتب کی بنیاد یہی ہے۔ جس شخص نے کسی کا حق چھینا ہو اسلام اسے اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعے وہ حق ادا کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور پھر

وہ دوا بھی دیتا ہے لیکن اسلام اسی پر اکتفا نہیں کرتا اور اس کے ساتھ ہی اپنے حق سے محروم کیے گئے شخص سے کہتا ہے کہ حق لینے کی جرأت ہے اور انہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہونا اور اسے واپس لینا چاہیے۔

ایک جملہ ہے جو امام علی علیہ السلام نے مالک اشترؒ کے نام اپنے مشہور خط میں نقل کیا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کئی موقعوں پر یہ فرماتے سنا: اس قوم میں پاکیزگی نہیں آ سکتی جس میں کمزوروں کو کھل کر طاقتوروں سے حق نہیں دلایا جاتا۔"

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ عہد نامہ ۵۳ صفحہ ۷۶۲)

یعنی کوئی امت اور کوئی قوم پاکیزگی، ترقی اور بہبود کے مقام پر نہیں پہنچتی مگر یہ کہ اس سے پہلے اس نے یہ مرحلہ طے کیا ہو کہ کمزور طاقتور کے مقابلے پر اٹھ کھڑا ہو اور اپنا حق یوں طلب کرے کہ اس کی زبان میں لکنت پیدا نہ ہو۔

پس جو کمزور اپنا حق طلب نہیں کر سکتا وہ اسے جانتا ہی نہیں ہے۔ جس معاشرے میں کمزور لوگ اتنے ضعیف النفس ہوں کہ اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہ کر سکیں ـــــ وہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ گزشتہ زمانے میں جوان مرد کیسے تھے؟ خود رسول اکرمؐ کیسے تھے؟

رسول اکرمؐ کی خصوصیات میں سے ایک روحانی قوت اور جسمانی طاقت تھی۔ آپ طاقتور تھے، شجاع تھے اور آپ قوت و شجاعت کی تعریف کرتے تھے۔ پس اسلام طاقت کو انسان کے لیے ایک قدر کے طور پر بھی تسلیم کرتا ہے۔

اسلام میں طاقت اور توانائی انسانی قدروں میں سے ایک قدر ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور قدریں بھی ہیں۔ یہ سب قدریں مل کر اسلام کا مطلوبہ کامل انسان تشکیل دیتی ہیں۔

نطشے نے تمام انسانی قدروں میں سے صرف یہی ایک قدر دیکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر آپ ایک باغ میں سے فقط ایک پودے کی آبیاری کریں تو وہی بڑھے گا اور دوسرے بہت سے پودے خشک ہو کر رہ جائیں گے۔

نطشے کے مکتب اور اسلام میں یہ فرق ہے کہ اس کے مکتب میں سیاست کو فقط ایک قدر حاصل ہے اور وہ ہے طاقت! تمام دوسری قدریں اس میں گم ہو جاتی ہیں اور اس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ لیکن اسلام میں طاقت انسان کی بہت سی بلند قدروں میں سے ایک قدر ہے اور جب یہ قدر دوسری قدروں کے ساتھ ملتی ہے تو ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین۔

گیارھویں نشست

مختلف مکاتبِ فکر کے نظریات کی تفصیل (۵)

"اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قرابت داروں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے۔ وہ بدکاری، بری حرکتوں اور سرکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔"
(سورۂ نحل، آیت ۹۰)

گزشتہ نشست میں کامل انسان کے بارے میں طاقت و قوت کے نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی تھی۔ اس مکتب میں کمال قطعاً قوت کے مساوی ہے اور نقص کمزوری کے مساوی ہے، حتیٰ کہ اچھے اور برے کو بھی اسی پیمانے اور اسی معیار سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ اچھے کے معنی طاقتور اور اچھائی کا مطلب توانائی ہے اور برے کے معنی کمزور اور برائی کا مطلب کمزوری ہے۔ عام طور پر فلسفی اپنی بحثوں کی توجیہ کمال اور نقص کی بنیاد پر اور متکلمین حسن و قبح (نیکی اور بدی) کی بنیاد پر کرتے ہیں جبکہ مکتبِ قدرت میں ان دونوں کی

طاقت اور کمزوری کے معیار پر جانچا گیا ہے۔ فلسفی کہتے ہیں کہ کمال اور نقص — ان کے نزدیک کمال کے معنی طاقت اور نقص کا مطلب کمزوری ہے۔ متکلمین کہتے ہیں حسن و قبح یا نیکی و بدی — ان کے خیال میں نیکی کے معنی طاقت اور بدی کا مطلب کمزوری ہے۔ تاہم مکتبِ قدرت میں حق و باطل اور عدل و ظلم کو بھی قدرتی طور پر اسی پیمانے یعنی طاقت اور کمزوری کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے یعنی حق ایسی چیز نہیں جو طاقت سے جدا ہو سکے اور باطل ایسی چیز نہیں جو کمزوری سے جدا ہو سکے۔

عدل اور ظلم کی بھی یہی صورت ہے، یعنی عدل کے معنی طاقت اور ظلم کا مطلب کمزوری ہے۔ لہٰذا اگر دو شخص آپس میں لڑ پڑیں اور ان میں سے ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور ہو اور غالب آ جائے تو اس مکتب کے مطابق وہی زیادہ کامل ہے۔

[illegible] ہے نیز صاحبِ حق اور صاحبِ عدل بھی ہے۔ اس کے برعکس جو مغلوب ہو جائے اور شکست کھا جائے — وہ ناقص ہے۔ مغلوب ہونا اور کمزور ہونا ایک نقص ہے اور اس کے معنی برائی، ظلم اور باطل پر ہونے کے ہیں۔ بہرحال اس مکتب میں دو غلطیاں وجود رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس مکتب میں طاقت کی قدر کے سوا تمام انسانی قدروں کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ طاقت خود ایک انسانی قدر ہے اور آجکل کی اصطلاح میں ایک خوبی ہے اور ہمارے پرانے فلسفیوں کی اصطلاح میں ایک کمال ہے — اس میں شک نہیں کہ طاقت — کمال کے مساوی ہے، لیکن کمال — طاقت کے مساوی نہیں ہے۔

لہذا ہمارے مکتب اور فلسفی ذات واجب الوجود کے بارے میں ثابت کرنے کے بعد کہ وہ وجود محض ہے اور وجود محض کمال کے مساوی ہے۔ اس کے بعد وہ ہر اس چیز کو جو کمال کے مساوی ہو، ذات حق کے لیے دلیل سے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ایک قدرت ہے۔ قدرت اپنی ذات کی حد تک کمال ہے اور وہ جو کچھ بھی ہے کمال ہے جیسا کہ علم، ارادہ، حیات اور زندگی کمال ہیں۔ لہذا انسان کے بارے میں بھی اس بات کی تردید نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے لیے بھی قوت اور قدرت ایک کمال ہے۔ کمزوری کی جانب میلان رکھنے والے مکاتب کہ جنہوں نے کمزوری کا پرچار کیا ہے وہ قطعی طور پر غلطی پر ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ قدرت تنہا کمال نہیں ہے، جیسے کہ حق تعالیٰ کی ذات میں بھی قدرت واحد صفت کمالیہ نہیں ہے۔ بلکہ ذات حق کی بہت سی صفات کمالیہ ہیں جو اسمائے حسنیٰ ہیں ان صفات کمالیہ میں سے ایک قدرت ہے اور ان اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم قادر ہے۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی صفت کمالیہ فقط قدرت ہی ہو۔

اس مکتب کی پہلی غلطی جو اگرچہ پہلی غلطی سے بڑی نہیں تو چھوٹی بھی نہیں ہے اور وہ خود قدرت کے بارے میں ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس مکتب میں قدرت کے علاوہ دوسرے کمالات اور قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ نظریۂ قدرت کا مدعی ہونے کے باوجود اس مکتب نے قدرت کو بھی ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔ کیونکہ اس نے قدرت کو صرف ایک چیز میں دیکھا ہے۔ یعنی اس کے دو مختلف درجوں میں سے صرف ایک درجے کو پہچانا کہ جو حیوانی قدرت ہے۔ حیوان کی قدرت اس زور سے عبارت ہے جو اس کے پٹھوں

میں ہوتا ہے۔ حیوان کی تمام قدرت منحصر ہے جو اس کے عضلات (پٹھوں) میں پائی جاتی ہے اور اس کی تمام خواہشیں بھی نفسانی خواہشیں ہوتی ہیں۔ انسان کا مکتب یہ ہے کہ اس میں پٹھوں کی قدرت کے علاوہ بھی قوت کا ایک باب وجود رکھتا ہے یعنی باطنی اگر یہ مکاتب قدرت کے حامل ہوں تو نتیجہ وہ نہیں ہوگا جو نطشے نے اخذ کیا کہ جس کی بنا پر انسان کے لیے قدرت کے تابع ہونا ضروری ہے لہذا آپ قدرت حاصل کرنے کی کوشش کریں اور جب آپ کو قدرت حاصل ہو جائے تو جو بھی عاجز ہو اس کے سر پر ضرب لگائیں اپنے نفس کی پرورش کریں اور اس دنیا کی مادی نعمتوں سے بہرہ مند ہوں۔ بلکہ نہیں اس قدرت کا نتیجہ بھی یہ نہیں ہے۔

اب میں اسلامی معیارات کے ساتھ ایک وضاحت کرتا ہوں اور رسول اکرمؐ کے بارے میں ایک داستان سے ابتدا کرتا ہوں۔

حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ مدینہ میں کسی جگہ سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ مسلمان نوجوان ایک پتھر کو وزن اٹھانے WEIGHT LIFTING کی مشق کے طور پر اٹھا اٹھا کر زور آزما رہے تھے وہ ایک بڑا سا پتھر تھا اور اس کے ذریعے ان کے زور کا اندازہ کیا جاتا تھا جیسے آجکل وزن اٹھانے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی کہتا کہ میں نے یہ خوب وزن اٹھایا، اور کوئی کہتا ہے کہ میں نے خوب اٹھایا ہے۔

رسول اکرمؐ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس مقابلے کا ثالث بن جاؤں؟

یہ سن کر سبھی خوش ہوئے اور انھوں نے یہ تجویز مان لی۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

اچھا تو میں تمہارا ثالث ہوں، اب تمہیں پتھر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے ایک معیار مقرر کرتا ہوں جس سے پتھر اٹھائے بغیر ہی پتہ چل جائے گا کہ کون زیادہ طاقتور ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

وہ شخص جسے کوئی شخص ایک گناہ کی ترغیب دے، اس کے اندر گناہ کی خواہش بھی ہو اور پھر بھی وہ اس خواہش کا مقابلہ کرے۔ نیز کسی کو کوئی چیز پسند ہو کہ جس میں گناہ اور معصیت ہو، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نفس کے مقابلے پر ڈٹ جائے تو وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

یہاں رسول اکرمؐ نے نفسانی خواہش کے مقابلے میں قوت ارادی کو پیش کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ زور فقط یہ نہیں ہے کہ ایک پتھر زمین سے اٹھا لیا جائے اور قدرت فقط یہ نہیں ہے کہ ایک بہت وزنی چیز کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا جائے کیونکہ یہ ایک ایسی قدرت ہے جو پٹھوں کے اندر ہوتی ہے اور یہ حیوانات کے پٹھوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ قدرت انسان اور حیوان کے درمیان مشترک چیز ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ قدرت کمال نہیں ہے   ہے تو وہ بھی ایک کمال، لیکن انسان کے بازوؤں اور اس کے بدن کے پٹھوں میں جو قدرت پائی جاتی ہے، اس سے بالاتر "قوت ارادی" ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشوں کا مقابلہ کر سکے۔

اسی منطق کی بنا پر اسلامی اخلاق اور بالخصوص ہماری عرفانی ادبیات میں بھی ان مسائل کو ایک قدرت کا نام دیا گیا ہے۔

رسول اکرمؐ نے مزید فرمایا:

اشد۔ تمام لوگوں میں زیادہ شجاع، طاقتور اور دلیر وہ شخص ہے جو اپنی نفسانی خواہشات پر غلبہ پائے۔

(نہج الفصاحت۔ کلمہ ۲۹۹)

یہاں بھی شجاعت، قدرت اور غلبے کا مسئلہ ہے جیسا کہ سعدی شیرازی نے کہا ہے:

گرت از دست برآید دہنی شیرین کن
مردی آن نیست کہ مشتی بزنی بر دہنی

یعنی مردانگی یہ نہیں ہے کہ انسان دوسرے کے منہ پر طمانچہ مارے بلکہ حقیقی قوت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہش کے برخلاف دوسرے کا منہ میٹھا کرے۔

مولوی معنوی کہتے ہیں:

وقت خشم و وقت شہوت مرد کو
طالب مردی چنینم کو بکو

جو غیض کی حالت اور نفسانی خواہش کی تحریک کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہم جگہ جگہ ایسے ہی مرد کی تلاش میں ہیں۔

(مثنوی مولانا روم۔ صفحہ ۲۹۵)

یہاں وہ مردانگی کو اس طرح جانچتے ہیں ــــ یعنی جب انسان کا غصہ

بھڑک اٹھے اور آگ کی بھٹی میں تبدیل ہو جائے تو مرد وہ ہے جو قوی ارادے
کا مالک ہو اور اس آگ کی بھٹی جو غصے کی آگ ہے اس کا مقابلہ کرے —
اسے کہتے ہیں مرد۔ اسے کہتے ہیں قوت اور قدرت — نیز جب شہوت
جوش میں آجائے اور انسان کو بے اختیار کر دے تو قدرت یہ ہے کہ انسان
اس وقت اپنی شہوت کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے۔ علمائے اخلاق نے اخلاقی
خوبیاں بتائی ہیں اور نقائص کو کمزوری کہہ کر ان کی نفی کی اور انہیں رد
کر دیا ہے اگر ہم ان کی صحیح جانچ پڑتال کریں تو ظاہر ہو گا کہ وہ سب قدرت
اور قوت کی علامتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات
کچھ چیزیں جو درحقیقت قدرت نہیں بلکہ کمزوری ہیں غلطی سے قدرت سمجھ لی
جاتی ہیں۔ لہٰذا علمائے اخلاق نے ہمیشہ کہا ہے کہ جذبات کو عقل اور ایمان
کے ساتھ توأم ہونا چاہیے۔ یعنی صرف یہ کہ انسان کے جذبات یکلخت برانگیختہ
ہو جائیں کافی نہیں ہے بلکہ انہیں عقل کی ترازو پر تولنا چاہیے کہ آیا یہ جذبہ بجا
اور منطقی ہے یا نہیں؟ مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں:

ترحم بر پلنگ تیز دندان
ستمکاری بود بر گوسفندان

چیر پھاڑ کرنے والے چیتے اور بھیڑیے پر رحم کرنا بیچاری بھیڑوں
پر ظلم ہے۔

یعنی اگر آپ کسی شخص کو اس بھیڑیے پر رحم کھاتے ہوئے دیکھیں جس
نے سیکڑوں بھیڑوں کو چیر پھاڑ کھایا ہو تو جان لیں کہ یہ رحم بھیڑوں کے بارے
میں ظلم کے برابر ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مثال ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ ایک ظالم

انسان پر رحم کرنا دراصل محکوم، مظلوم اور محروم لوگوں پر ظلم ہے۔ ظالموں پر
ترس وہ لوگ ہی کھاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایک آیت ہے:
ایسے مرد و عورت کے بارے میں جو زنا کرے۔ چنانچہ اگر ایک بیوی والا مرد
زنا کرے تو اسلام میں اس کی سزا سنگسار کرنا (قتل کرنا) ہے اور اسی طرح اگر
ایک شادی شدہ عورت زنا کرے تو اس کی سزا بھی سنگسار کرنا ہے۔ جیسا کہ
قرآن مجید کہتا ہے:

اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم خدا
کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا ترس
بھی نہ ہونے پائے اور دونوں کی سزا کے وقت مومنین کی
ایک جماعت کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔
(سورۂ نور، آیت ۲)

یعنی مومنین کا ایک گروہ وہاں موجود ہونا چاہیے اور وہ لوگ جائیں
اور انہیں قتل کرنے کے کام میں شرکت کریں لیکن یہ ایک ایسا مقام ہے کہ
وہ افراد خصوصاً وہ لوگ جو معاشرے کی بلند تر مصلحتوں کو نہیں سمجھتے جب
یہ دیکھتے ہیں کہ دو انسان مارے جانے والے ہیں تو ان کے جذبات ابھرتے
ہیں اور سب کی یہ خواہش ہو کہ ان پر رحم کیا جائے۔

انہی لوگوں کے خیال کی تردید کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے کہ یہ موقع
اسی امر کے اجرا اور حکم خداوندی پر عمل کرنے کا ہے جو پوری نوع انسان کی
بہبود اور ہمہ گیر مصلحتوں کی بنیاد پر بنایا گیا ہے اور اس میں رحم دلی کی کوئی

کا حق نہیں، کیونکہ یہ جمہوری معاشرے پر ظلم ہے۔ یہ بات آجکل بھی بہت زیادہ زیر بحث رہتی ہے اور اکثر لوگ کہتے ہیں کہ پھانسی کیوں دی جائے؟ موت کی سزا میں کیا معقولیت ہے؟ موت کی سزا سراسر غیر انسانی فعل ہے۔ ان کی بات کا مطلب یہ ہے کہ مجرم نے خواہ کسی بھی جرم کا ارتکاب کیا ہو اسے موت کی سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ پھر اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے۔" یہ ایک عجیب اور بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے اور ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے کہ ان سے جرم سرزد ہو لیکن یا تو معاشرے میں ضرورت کے مطابق تربیت نہیں ہوتی جیسا کہ اکثر معاشروں کا حال ہے اور نہ صرف یہ کہ اصلاح کے عوامل وجود نہیں رکھتے بلکہ فساد اور بگاڑ کے عوامل وجود رکھتے ہیں۔ بالفرض اگر اصلاح کے کافی عوامل وجود رکھتے ہیں تو بھی معاشروں میں ہمیشہ انحراف کے عوامل بھی ہوتے ہیں اور وہ اصلاحی عوامل کے باوجود جرائم کے ارتکاب کا موجب بنتے ہیں۔ ان کا کیا علاج کرنا چاہیے؟ جونہی موت کی سزا منسوخ کی جائے گی اس کے ساتھ ہی وہ مجرم جن کی تمام کوششوں کے باوجود اصلاح نہ ہو سکی ہو یا معاشرے میں تربیتی عوامل وجود نہ رکھتے ہوں یا بالفرض موجود ہیں لیکن کافی نہیں ہیں تو وہ پہلے کی طرح جرائم میں سرگرم ہو جائیں گے۔

کیا یہ درست ہے کہ ہم آج اس بہانے کہ مجرم کی اصلاح کرنی چاہیے اسے چھوڑ دیں تاکہ وہ جرم کرے اور پھر اس کی اصلاح کریں؟ یہ تو ارتکاب جرم کے لیے مجرم کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ کیونکہ وہ مجرم کہتا ہے معاشرے نے آج تک میری اصلاح کے بارے میں نہیں سوچا۔ جب میں بچہ تھا تو

میرے ماں باپ نے میری تربیت اور اصلاح نہیں کی اور جب میں بڑا ہو گیا تو بھی کسی نے میری اصلاح نہیں کی۔ بہتر ہو گا کہ میں جرم کروں اور مجھے گرفتار کر کے قید خانے میں بھیج دیا جائے اور وہاں میری تربیت اور اصلاح کی جائے تاکہ میں ایک اچھا آدمی بن جاؤں۔

نیز ایک اور مجرم کہتا ہے: چور کے ہاتھ کاٹنے کا کیا مطلب ہے؟ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیکن اگر ہم جرائم کے صفحات پر نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ چوری کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ کتنی کثیر مقدار میں مال لوٹا جاتا ہے بلکہ اس میں کتنے ہی اور جرائم بھی ہوتے ہیں اور کتنے انسان مارے جاتے ہیں۔ اگر چور کو فوراً حقیقی سزا دی جائے اور چور کو پورا پورا یقین ہو کہ اگر وہ چوری کرے گا تو پولیس اور قانون کے چنگل میں پھنس جائے گا۔ پھر قانون اس کی چار انگلیاں کاٹ دے گا اور جرم کا یہ داغ مرتے دم تک اس کے بدن پر رہے گا۔ بخدا اگر دو چار چوروں کو بھی ایک ہی مرتبہ یہ سزا دی جائے تو چوری مکمل طور پر ختم ہو جائے اور ہمیشہ کے لیے اس کا دروازہ بند ہو جائے۔

آج سے پچاس یا ساٹھ سال پیشتر جو حاجی حج کو گئے تھے وہ جانتے ہیں کہ عربستان میں چوری کی وضع بڑی عجیب تھی۔ حاجیوں کے وہ قافلے جن میں دو سو افراد ہوتے وہ ان راستوں پر سفر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ وہ مسلح ہوتے تھے اور اپنے ساتھ فوجیوں کو لے جاتے تھے۔ اس کے باوجود کوئی سال نہیں گزرتا تھا جب یہ اطلاع آتی ہو کہ بدوؤں نے حاجیوں کے قافلوں پر حملہ کر دیا ہے حاجیوں کو مار ڈالا اور سامان لوٹ کر لے گئے۔

سعودی حکومت نے خواہ چند ایک بڑے کام کیے ہوں لیکن کم از کم یہ اچھا کام کیا ہے کہ چور کو عرفات میں یا منیٰ میں یا نہ جانے کہاں، لوگ ان دنوں میں جب تمام حاجی موجود تھے اور قرآن کے حکم اس کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو وہاں موجود ہونا چاہیے کے مطابق ان سب کی موجودگی میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور چور کا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔ پھر دیکھنے میں آیا کہ وہ سب لوگ جو چور تھے ان کی اصلاح ہو گئی اور آخرکار چوری کا خاتمہ ہو گیا۔ البتہ ان میں سے کچھ لوگ تنگدستی و ناداری کی وجہ سے چوری کرتے تھے اور وہ ناداری اب بھی موجود ہے۔ کیونکہ فقط سعودی شہر ہی مالدار ہیں۔

پھر ہم نے دیکھا کہ حاجیوں کا سامان گرا رہتا ہے اور کئی دن گزر جاتے ہیں لیکن کوئی شخص اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاست قرآنی حکم خدا کے نافذ کرنے میں تم کو ان کے بارے میں کسی طرح کا ترس نہیں آنا چاہیے کے مطابق چوری کرنے والے کو صحیح مقام پر سخت سزا دی جاتی ہے یعنی یہاں کا نظم غیر منطقی ہے اور فسادات کے مواقع بھی اور ہوتے ہیں۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ مکتب قدرت جو ہمیشہ قوت کا دم بھرتا اور بڑے زور کا نعرہ لگاتا ہے اس نے جہاں دوسری انسانی قدروں کو نہیں پہچانا خود قدرت کی حقیقت کو نہیں جانا کہ وہ کیا ہے۔ ہاں اصل طاقت اور قدرت یہ ہے کہ انسان دوسرے کی مدد کے لیے دوڑے اور حقیقی صاحب قوت و قدرت روح وہ ہے جو اپنے فرزندوں سے کہتی ہے:

ظالم کے دشمن اور مظلوم کے مددگار بنو۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین۔ وصیت ۴۷ صفحہ ۷۷۶)

امام علی علیہ السلام اپنے دو عزیز فرزندوں حسن و حسین علیہم السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پیارے فرزندو! تمہاری قدرت اور تمہاری قوت کو ہمیشہ مظلوم کی مدد میں کام آنا چاہیے اور ظالم کے ساتھ جنگ میں صرف ہونا چاہیے۔ یہ ہے قدرت —— لیکن وہ دشمنیاں، حسد اور لغزشیں جو نطشے پیش کرتا ہے بات تو یہ ہے کہ سب کی سب کمزوری سے جنم لیتی ہیں —— ہاں تو جس آدمی کا دل ہمیشہ یہ چاہتا ہو کہ لوگوں سے انتقام لے، جو آدمی دوسروں کی برائی چاہتا ہو، جو شخص کینہ میں مبتلا ہو اور ہمیشہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہو، جیسا کہ نطشے نے کہا ہے، وہ ایسی باتیں قدرت کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ کمزوری کی بدولت کرتا ہے۔ کیونکہ انسان جتنا زیادہ صاحب قوت ہوتا ہے اس کا حسد اور کینہ کم ہوتا ہے۔

امام حسین فرماتے ہیں "طاقت و قوت کینے کو ختم کر دیتی ہے"۔ یہ جملہ عجیب ہے، جس کی بنیاد بے حد دقیق نفسیاتی مشاہدہ پر رکھی گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں طاقت کینے کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ یعنی جب انسان اپنے اندر طاقت محسوس کرتا ہے تو اس میں دوسروں کے لیے کینہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے برعکس جو آدمی ہے یہ کمزوری ہی ہے جو ہمیشہ دوسروں کے لیے کینہ رکھتا ہے اور ان سے حسد کرتا ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا ایک جملہ غیبت کے بارے میں ہے

اور دوسری بڑی بیٹھ بہا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا: جو لوگ غیبت کرتے ہیں، جن کا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کی پیٹھ پیچھے برائی کریں اور دوسروں کی بدگوئی سے لذت محسوس کرتے ہیں، وہ کون لوگ ہیں؟

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: وہ وہی لوگ ہیں جو کمزور و عاجز و ناتواں ہوتے ہیں۔

کمزور آدمی کا یہی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرے۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۴۶۱ صفحہ ۹۵۲)

غیبت ایک کمزور انسان کی کوشش کی انتہا ہے۔ ایک قوی اور صاحب قدرت انسان جو ہر طرح میں قدرت کا احساس کرتا ہے کبھی غیبت کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے اور وہ غیبت کو گھٹیا اور کمزور انسانوں کا کام سمجھتا ہے۔

آپ دیکھیں کہ امام علی علیہ السلام غیبت کو کمزوری پر مبنی قرار دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایک مضبوط روح ہرگز غیبت نہیں کرتی حتیٰ کہ آپ زنا کو بھی کمزوری کا نتیجہ قرار دیتے اور فرماتے ہیں:

غیرت مند کبھی زنا نہیں کرتا۔

(نہج البلاغہ مفتی جعفر حسین حکمت ۳۰۵ صفحہ ۹۰۷)

یعنی ساری دنیا میں ایک آدمی بھی جو اپنے اندر ذرہ بھر غیرت رکھتا ہے اس نے کسی عورت سے زنا نہیں کیا اور دوسروں کی عزت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ ہاں وہ فقط بے غیرت آدمی ہیں جو یہ کام انجام دیتے ہیں۔

بے غیرت آدمی سے مراد وہ انسان ہے جو اپنے اندر کمزوری محسوس کرتا ہے یعنی وہ آدمی کہ اگر دوسرے اس کے ناموس کے ساتھ وہی کام انجام

دیں تو اسے تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ فقط بے غیرت لوگ ہیں جو زنا کرتے ہیں اور صحیح لوگ ہرگز زنا نہیں کرتے لیکن نطشے ان قدروں کو نہیں پہچانتا اور وہ یہ کہتا ہے کہ قدرت کے معنی بازو کی قوت اور اسلحہ کی طاقت کے ہیں۔ قدرت کے معنی اپنے پاس اسلحہ ہونا اور اس کے ساتھ دوسروں کے مرجوع ہیں۔ اس کا سپرمین SUPERMAN ایک بہت بڑا حیوان ہے۔ وہ ایک ایسا مرد ہے جس کے بازوؤں میں بہت زیادہ زور ہے لیکن اسے روحانی قدرت اور قوت کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہے۔

پس اسلام کے مکتب میں قدرت ایک انسانی قدر، ایک انسانی کمال اور انسان کے چہرے کے خطوط میں سے ایک خط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کمزور انسان کو پسند نہیں کرتا اور خود کو سست اور کمزور نہیں سمجھنے دیتا لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام قدرت کو انسان کی واحد قدر نہیں سمجھتا اور وہ دوسری قدروں کا بھی قائل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے قدرت کی تعبیر نطشے اور فلسفہ کی [illegible] کی تعبیر سے مختلف ہے۔ اسلام انسان میں قدرتوں کا قائل ہے [illegible] و تقویت پہنچاتا اور ابھارتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اس سے مختلف ہے جو نطشے نے کہا ہے کیونکہ اس میں معاشرے کی بھلائی ہے۔ بعد میں وہ کہتا ہے:

[illegible] جو انسان کا دل پسیجتا ہے تو یہ کمزوری کی وجہ سے ہے —— نہیں [illegible] گفتگو سخاوت کی ہے اور گفتگو [illegible] سے [illegible] صاحب! آپ معاملے کو اس طرف سے کیوں نہیں دیکھتے؟

آپ اس معاملے کو اس زاویے سے دیکھیے کہ ایک صاحبِ قدرت شخص کا فیض دوسروں کو پہنچتا ہے یا ایک کمزور شخص کا؟ کیا قدرت سے فیض پہنچایا جا سکتا ہے یا کمزوری سے؟ ظاہر ہے فیض قدرت ہی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔

ایک اور مکتب بھی ہے اور وہ مکتبِ محبت ہے، جس کا پرچار ہندوستان میں زیادہ ہوا ہے اور کسی حد تک مسیحیوں نے بھی اسے رائج کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی اپنے مذہب کو مکتبِ محبت کہتے ہیں، لیکن وہ اس مقام پر پہنچتے ہیں کہ اب اس کو مکتبِ ضعف کا نام دیا جا سکتا ہے اور وہ مکتب اصل میں کمزوری کی سمت کشش رکھتا ہے۔ لیکن اہلِ ہند کے مکتب کو صحیح طور پر مکتبِ محبت کہا جا سکتا ہے۔ مکتبِ محبت میں انسان کا کمال خدمتِ خلق اور لوگوں سے محبت کرنے کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ یہ نطشے کے مکتب کے بالکل برعکس ہے اور اس نے جن چیزوں کی نفی کی ہے، اس کے مقابلے میں ان کا اثبات کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر کامل انسان سے مراد وہ انسان ہے جس کا فیض خلقِ خدا تک پہنچے اور انسانیت کے معنی خلقِ خدا کو فیض پہنچانے کے ہیں۔ بلکہ مغربی مصنف جب انسانیت اور انسان کی جانب جھکاؤ کی بات کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہی لوگوں کی خدمت اور لوگوں سے محبت ہی ہوتی ہے۔

ہمارے عہد میں ادیان و مذاہب یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز انسانی ہے یا انسانی نہیں ہے تو انسانی ہونے سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خلقِ خدا کے لیے نفع رساں ہے اور غیر انسانی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لیے مفید

نہیں ہے۔ جبکہ اس بنا پر انسانیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسانوں اور مخلوقِ خدا کی خدمت کی جائے۔ خود ہمارے شعرا نے اس سلسلے میں بہت سی تعبیریں کی ہیں۔ مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں:

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

گدڑی اوڑھے ہوئے مصلے پر بیٹھ کر تسبیح پھیرنا نہیں، بلکہ خلقِ خدا کی خدمت کرنا عین عبادت ہے۔

اس مکتب میں سعدی کا ایک اور عقیدہ بھی ہے اور وہ ان صوفیوں پر تنقید کرتا ہے جن کا کام تسبیحیں پڑھنا، سجادے پر بیٹھنا اور درویشی کی گدڑی اوڑھنا ہے اور لوگوں کو خیر و صلاح کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں۔ سعدی اگرچہ خود بھی درویش ہیں لیکن ان کا روئے سخن ان درویشوں کی طرف ہے۔ یہ سب خلق کی بات جن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی اور نے بھی یہی بات کہی ہے۔ دوسروں نے اس کو مختلف تعبیرات کے ساتھ کہی ہے لیکن یہ تعبیرات درست نہیں ہیں۔ مثلاً:

می بخور منبر بسوزان، مردم آزاری مکن

شراب پیو، مسجد کا منبر جلاؤ ۔۔۔ مگر لوگوں کو ستانے سے باز رہو۔

ان کے نقطۂ نگاہ کے مطابق دنیا میں فقط ایک بدی وجود رکھتی ہے اور وہ مردم آزاری ہے اور ایک نیکی وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ چنانچہ مکتبِ محبت کے نقطۂ نظر سے عالمِ بشریت میں

فقط ایک کمال وجود رکھتا ہے ـــــ ایک ہی قدر وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔ نیز صرف ایک ہی نقص وجود رکھتا ہے ـــــ ایک بدی وجود رکھتی ہے اور وہ لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس مکتب پر بھی تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کی بھی جانچ پڑتال کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق خدمت خلق اور لوگوں کے ساتھ احسان ایک اعلیٰ اور انسانی قدر ہے۔ لوگوں سے محبت کرنا، ان کی خدمت کرنا اور ان سے ہمدردی رکھنا اسلام کے نزدیک ایک کمال ہے، ایک قدر ہے اور ایک نیکی ہے لیکن اسلام سب کچھ چھوڑ کر فقط محبت اور احسان پر انحصار کرنے کے خلاف ہے:

اس میں شک نہیں کہ خدا انصاف اور نیکی کرنے اور قرابتداروں کو کچھ دینے کا حکم کرتا ہے۔ وہ بدکاری، بری حرکتوں اور سرکشی کرنے سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں آگاہ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۹۰)

خدا تمہیں عدل کا حکم دیتا ہے یعنی تم دوسرے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرو، ان کے حقوق کی حد میں قدم نہ رکھو اور ان کے ساتھ احسان کرو، یعنی نہ صرف یہ کہ لوگوں کے حقوق پر تجاوز نہ کرو بلکہ اپنے مشروع حقوق میں سے بھی انہیں کچھ دیدو۔

ایثار ایک قرآنی اصول ہے یعنی انسان جو چیز خود رکھتا ہو وہ اس کا اپنا مال ہو اور اسے اس کی شدید ضرورت بھی ہو، پھر بھی وہ اس چیز کے بارے میں دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھے۔ ایثار انسانیت کے باشکوہ ترین

مظاہر میں سے ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔

ان انصار کے بارے میں جنہوں نے مہاجرین کو اپنے آپ پر مقدم رکھا قرآن نے ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا ہے:

"اور چاہے اپنے اوپر تنگی ہی ہو وہ دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں۔ (سورۂ حشر۔ آیت ۹)

اسی طرح وہ آیات ہیں جو امام علی مرتضیٰؑ، بی بی فاطمہ زہراؑ اور حسنین علیہم السلام یعنی اہل بیت کی شان میں نازل ہوئیں، ان میں درج ہے:

"وہ اس (خدا) کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (کہتے ہیں) ہم تو تم کو بس خاص خدا کے لیے کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تم سے بدلہ اور نہ شکرگزاری چاہتے ہیں۔ (سورۂ دہر۔ آیت ۸-۹)

حسنین علیہم السلام کی ایک بیماری سے صحت یابی کے بعد جبکہ انہوں نے نذر مانی تھی، علیؑ، زہراؑ اور حسنینؑ روزہ رکھتے ہیں۔ پھر امام علیؑ جو لاتے ہیں اور بی بی زہراؑ اس کی روٹی پکاتی ہیں۔ افطار کے وقت ایک یتیم آتا ہے اور یہ سب اپنا کھانا اٹھا کر اسے دے دیتے ہیں۔ اگلی رات اور پھر اگلی رات کو بھی یہی صورت پیش آتی ہے، حتیٰ کہ مذکورہ آیت نازل ہوئی ہے۔ بہرحال مسئلہ ایثار کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایثار ایک بلند ترین انسانی قدر اور مقام ہے۔ اسلام نے بھی ایثار کی تعریف کی ہے اور یہ عموم رحم اور مہربانی ایسی چیزیں ہیں جو اسلام کی طرف سے ہمیشہ پیش کی جاتی رہی ہیں۔

زمانۂ جاہلیت کے اشراف میں سے ایک شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے اپنے ایک فرزند کو اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا اور اس کے بوسے لے رہے تھے اور اسے سینے سے لگا رہے تھے۔ اچانک اس شخص نے آپ کو متوجہ کیا اور کہا: میرے دس بیٹے ہیں اور میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی ایک کا بوسہ بھی نہیں لیا۔ یہ وہی جذبے کا مکتب ہے۔ کیونکہ بوسہ لینے کے معنی رحم کے ہیں اور رحم کمزوری کی علامت ہے۔ یہ کام ایک قوی انسان کو زیب نہیں دیتا۔

روایت میں آیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اس قدر برہم ہوئے کہ آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا:

"جو شخص دوسرے پر رحم نہ کرے خدا بھی اس پر رحم نہ کرے گا۔"

پھر فرمایا:

"اگر خدا نے تمہارے دل سے رحم کو کھرچ دیا ہے تو میں کیا کروں۔"

اس موضوع پر ہمارے پاس بہت سی روایات اور احادیث ہیں۔ امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی زندگی اس بارے میں بجائے خود بہترین نمونہ ہے کیونکہ آپ بنیادی طور پر شفقت اور مہربانی کا مجسمہ ہیں اور ایسے انسان ہیں کہ جب وہ کمزور کے سامنے ہوتے ہیں تو ان کی شفقت اور محبت کا سمندر جوش میں آتا ہے۔

دنیائے مغرب میں ایثار اور محبت

ہم نے گزشتہ بحثوں میں اس امر کی جانب اشارہ کیا تھا کہ اہلِ مغرب

بنیادی طور پر مادی قطب ہیں۔ خود اہلِ مغرب بھی اس چیز کا اعتراف کرتے ہیں اور حتیٰ عاطفی محبتوں، احسانوں اور شفقتوں کو مشرقی خصلتوں کا نام دیتے ہیں۔ حتیٰ اولاد کے لیے باپ کی محبت، ماں باپ کے لیے بیٹے کی محبت اور اسی طرح بھائی کی بھائی سے محبت اور بہن کی بہن سے محبت یا بھائی کی بہن سے محبت کے بارے میں ان کے ہاں بہت کم الفاظ ملتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ مشرق بھی رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسانی جذبات مخصوص طور پر مشرق ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور مغرب کی سرزمین میں بہت کم نصیب ہے۔ اگرچہ وہاں خود ان کے درمیان اجتماعی عدالت موجود ہے لیکن احسان و محبت وغیرہ کے جذبات کا کوئی وجود نہیں ہے۔

مجھ سے ایک دوست نے بیان کیا کہ وہ یورپ گیا۔ وہ کہنے لگا کہ جب میں بیمار ہو گیا تو اس کے بعد بھی نقاہت کے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اپنے بیٹے کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا اور وہ میری خدمت کر رہا تھا۔ جب میں نے دوسری طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ایک مرد اور ایک عورت جن کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ میاں بیوی ہیں وہ بیٹھے تھے اور ہماری حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ پھر جب میرا بیٹا اٹھا اور ان کے پاس سے گزر کر باہر جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے بیٹے سے کچھ باتیں پوچھ رہے ہیں اور وہ ان کی بات کے جواب دے رہا ہے۔ جب وہ واپس آیا تو میں نے پوچھا وہ لوگ تم سے کیا کہہ رہے تھے؟ اس نے کہا: وہ پوچھ رہے تھے کہ یہ شخص کون ہے جس کی تم اتنی خدمت کر رہے ہو؟ میں نے کہا: یہ میرا باپ ہے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے ـــــ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تم اس کی اتنی خدمت کرو؟ وہ

کہنے لگا کہ میں خود ان کی منطق کے مطابق ان سے گفتگو کی اور کہا کہ میں کیوں
نہ خدمت کروں جبکہ وہ مجھے اپنا فرض سمجھتے ہیں تاکہ میں بھی تعلیم حاصل کر سکوں۔
یہ سن کر انہوں نے بڑا تعجب ظاہر کیا اور چند منٹ کے بعد وہ ہمارے پاس
آئے اور گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے: ہمارا بھی ایک بیٹا ہے جو فلاں ملک
میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پھر دونوں بعد میں بیٹے سے متعلق بتا رہے تھے میں نے ان سے
متعلق تحقیق کی اور مجھے پتہ چلا ہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔ ان کا کوئی
بیٹا نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ بیس سال قبل ہماری باہم ملاقات ہوئی
تھی۔ اس وقت ہم نے طے کیا تھا کہ ہم کچھ مدت اکٹھے رہیں، اگر ہمارے اخلاق
ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئے تو رسمی طور پر شادی کر لیں گے۔ مگر اب تک
ہمیں شادی کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ اب یہاں اکثر اس قسم کے
لوگ ہیں۔

مرحوم محقق جو حضرت آیت اللہ العظمیٰ آقائے بروجردی کی طرف
سے جرمنی گئے تھے۔ انہوں نے ایک داستان نقل کی جو بڑی عجیب ہے
وہ کہتے ہیں: جرمنی میں ہمارے قیام کے زمانے میں وہاں کا ایک فاضل
پروفیسر مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ اکثر ہمارے پاس آتا اور گاہ بگاہ ہم بھی اسے ملنے
جاتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اسے سرطان کا مرض لاحق ہو گیا تو وہ ہسپتال
چلا گیا جہاں ہم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اس کی عیادت کے لیے جاتے
تھے۔ ایک دن اس نے بچوں کی شکایت کے لیے زبان کھولی اور کہا:
جب میں بیمار ہو کر صاحب فراش ہو گیا تو ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ مجھے سرطان
کا مرض ہے۔ تب میرا بیٹا اور میری بیوی دونوں آئے اور کہنے لگے معلوم ہوا

ہے کہ تمہیں سرطان ہو گیا اور تم مرنے والے ہو۔ لہٰذا ہم خدا حافظ کہہ رہے ہیں
پس وہ دونوں چلے گئے اور انہیں یہ خیال نہ آیا کہ یہ کم نصیب ایسی حالت میں
ہے جسے محبت اور مہربانیوں کی ضرورت ہے۔

مرحوم محقق نے مزید بتایا تھا کہ ہم بار بار اسے دیکھنے جاتے تھے۔ ایک
دن جب ہسپتال والوں نے اطلاع دی کہ وہ مر گیا ہے تو ہم اس کے کفن
دفن کے لیے گئے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں اس کا بیٹا بھی آیا ہوا ہے اور جب
ہم نے اس طرح تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ جنازہ اسی لیے
مرنے سے پہلے ہی خود کو ہسپتال کو فروخت کر دیا تھا۔ اب وہ اس لیے آیا
تھا کہ ہسپتال والوں کے حوالے کر دے اور ان سے قیمت وصول کر کے واپس
چلا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے معاشرے میں بھی دردمندی
کے واقعات رونما ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے بہت سے کام مروت
کے جذبے کی بنا پر انجام دیتے ہیں وہ عاطفہ نہیں بلکہ ایک قسم کی خود غرضی ہے
عاطفہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مشروع حق کو دوسرے کے فائدے
کے لیے پیش کر دے۔ تاہم ایسے آدمی کے لیے ضروری ہے کہ اس نے اس
سے پہلے اپنے فرائض ادا کر لیے ہوں۔ وہ اس طرح کہ اس نے لوگوں کے حقوق پر
تجاوز نہ کیا ہو۔ وہ لوگوں کے حقوق کو محترم سمجھے، اپنا حق حاصل کرے اور
اس کے بعد اپنے مشروع حق اور اپنے حصے کو لوگوں کے فائدے کے لیے چھوڑ
دے۔ جب کوئی شخص یہ کام انجام دے تو کہا جاتا ہے کہ وہ عاطفہ انسانی
رکھتا ہے۔ یہاں ہم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے حق پر قانع نہیں ہوتے
اپنی زندگی میں جس وسیلے سے بھی ممکن ہو دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پھر ایک دن آپ سنتے ہیں۔ فلاں دوست کی خاطر انہوں نے کئی ہزار روپے خرچ کر دیے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے سخاوت، انسان دوستی اور عاطفہ اجتماعی قرار دیں لیکن یہ عاطفۂ اجتماعی نہیں ——— یہ خود غرضی ہے، یہ شہرت طلبی ہے اور وہ شخص اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہے۔ اس شخص نے پہلے کئی ایک انسانوں کے حقوق پامال کیے اور پھر ایک شخص کے لیے کچھ رقم خرچ کر دی ہے ——— اسے انسان دوستی نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ہم میں سے بعض افراد کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ گھر لے آتے ہیں اور اسے مہمان نوازی کا نام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مرد ہیں اور مرد کے گھر کا دروازہ مہمانوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔ یہ بذاتِ خود اچھی بات ہے لیکن ہم اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ وہ عورت جو ہمارے گھر میں ہے، شرعی طور پر ہم اسے حکم دینے کا حق نہیں رکھتے اور وہ مختار ہے کہ اگر اس کی مرضی نہ ہو تو ہمارے گھر کا کوئی کام نہ کرے لیکن ہم مہمانداری کا یہ تمام بوجھ اور مصیبت اس بیچاری عورت پر ڈال دیتے ہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم تو بڑے مہمان نواز ہیں۔ مگر وہ مہمان نوازی جس کے نتیجے میں ایک انسان پر ظلم ہوتا ہو مہمان نوازی نہیں ہے۔

اب ذرا علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھیے کہ آپ گھر کے کام میں اپنی زوجہ حضرت زہراؑ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ وہ کام ہیں جو اس پاک بی بی نے خود اپنی رضا سے اپنے ذمے لیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تاکہ آپ کی عزیز شریکۂ حیات پر کام کاج کا سارا بوجھ نہ پڑے۔ پس اگر کوئی انسان یہ چاہے کہ اس کے کام انسانی جذبے کی بنیاد پر ہوں تو پہلے

اسے عدالت کے مرحلے سے گزرنا چاہیے۔ یعنی وہ عادل ہو اور کسی کے حق پر تجاوز نہ کرے۔ پھر اگر وہ اپنے مشروع حقوق میں سے ایثار کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ہم کئی ایک بزرگ علماء کو جانتے ہیں جو اس بات کے پابند تھے کہ کسی کے حق پر معمولی سے معمولی تجاوز بھی نہ کریں۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی اس بات پر تیار نہ ہوتے کہ کسی ایسے کام کے بارے میں جو خود ان سے متعلق ہو ایک بار بھی اپنی بیوی، بیٹی یا بیٹے کو حکم دیں۔ البتہ ان کا یہ اصول اس کام کے متعلق تھا جو خود ان کے اپنے کرنے کا ہوتا تھا اور اس کام کے بارے میں نہیں جس سے دوسروں کی تربیت مقصود ہوتی تھی۔

مرحوم حاج میرزا محمد تقی شیرازی جو بزرگ مراجع میں سے تھے ان کے بارے میں مرحوم استاد حاج شیخ عبد الکریم حائری نے نقل کیا ہے: وہ اپنے کام کے لیے کبھی کسی کو حکم نہیں دیتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو ان کے گھر والوں نے ان کے لیے کھانا تیار کیا۔ بچے کھانا لے کر آئے اور ان کے نزدیک رکھ کر چلے گئے۔ چونکہ وہ خود بیمار اور صاحبِ فراش تھے اس لیے اٹھ نہ سکے اور اسی طرح دو تین گھنٹے گزر گئے۔ جب وہ لوگ ان کے پاس آئے تو دیکھا کہ کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہے اور انہوں نے نہیں کھایا۔ چونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی بچے کو آواز دیتے کہ آؤ یہ کام میرے لیے کر دو۔ اس لیے انہیں شبہ ہو کہ آیا اس کام کے لیے ان کا کسی بچے کو بلانا جائز ہے یا نہیں؟ پس ایثار اس وقت بہت اچھا ہے جب خود غرضانہ اور خود خواہی سے نہ ہو۔

رسول کریمؐ کے بعض اصحاب جو جنگ موتہ میں شریک تھے، ان کے بارے میں ایک داستان نقل کی گئی ہے جو بڑی حسرت انگیز ہے اور جو کچھ انہوں نے کر دکھایا اسے صحیح معنوں میں ایثار کہتے ہیں۔

جنگ موتہ میں کچھ اشخاص زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ چونکہ زخمی کے بدن سے خون خارج ہو جاتا ہے، اس لیے سخت پیاس لگتی ہے اور زخمی شخص کو پانی کی حاجت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کو زخمی ہونے اور بدن سے زیادہ خون بہ جانے سے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ تب ایک شخص نے پانی سے بھرا ہوا برتن اٹھایا اور ان زخمی مسلمانوں میں پانی تقسیم کرنے لگا۔ وہ ان کے قریب سے گزر رہا تھا تاکہ اگر کسی زخمی کو پانی کی ضرورت ہو تو اسے پلا دے۔ جب وہ ایک زخمی کے پاس پہنچا اور دیکھا کہ وہ پیاسا ہے تو اس نے اسے پانی پلانا چاہا۔ لیکن اس زخمی نے ایک اور زخمی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ پیاسا ہے۔ وہ فوراً اس زخمی کے پاس پہنچا، لیکن اس نے ایک تیسرے کے بارے میں کہا کہ وہ اس پانی کا مجھ سے زیادہ مستحق ہے۔ جب وہ پانی لے کر تیسرے شخص کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ دوسرے کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بھی مر چکا ہے۔ اسے کہتے ہیں ایثار اور قربانی ـــــ یعنی انتہائی ضرورت کے باوجود بھی دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم رکھنا!

وہ دو اعتراض جو ہم نے مکتب قدرت پر کیے تھے، بعینہ وہی دو اعتراض مکتب محبت پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ مکتب محبت بھی ایک قدر کا حامل ہے یعنی اس نے باقی قدریں بھلا کر فقط خدمت و محبت کی قدر کو اپنا

لیا ہے۔ محبت انسان کے لیے کمال ہے اور فیاضی انسان کے لیے کمال ہے اور جیسے کہ فلسفیوں نے ثابت کیا ہے کہ فیاضی، جود اور بخشش صفات کمالیہ میں سے ایک صفت ہے جو ذات باری تعالیٰ کے لیے بھی ہے۔ لہٰذا ذات باری تعالیٰ خود فیاض علی الاطلاق ہے۔ کیونکہ فیاضی خود اس کی صفت کمال ہے۔ پس اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے یہ غلطی کی ہے کہ دوسری قدروں کو فراموش کر دیا اور کہا کہ خدمت خلق کے علاوہ کوئی دوسری چیز وجود نہیں رکھتی اور انسانیت پرستی ہے۔

یہ ایک غلطی اور بہت بڑی غلطی ہے ـــــ جیسے کہ مکتب قدرت نے بھی ایسی ہی بڑی غلطی کی اور کہا تھا کہ زور اور قدرت ہی سب کچھ ہے، لہٰذا انہوں نے انسان کی روحانی اور عقلیاتی قوتوں کو فراموش کر دیا تھا۔ چنانچہ خدمت خلق کے سلسلے میں بھی ایک ایسی ہی بڑی غلطی وجود رکھتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں۔

وہ لوگ نعرہ لگاتے ہیں: خدمت خلق کا مطلب کیا ہے؟ آپ بتائیں کہ کس چیز میں خلق کی خدمت؟ ذرا وضاحت کریں کہ کس چیز میں ہم خلق خدا کی خدمت کریں۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ خلق خدا کے پیٹ کی خدمت یعنی خلق خدا بھوکی ہے اور اس کے پیٹ کی خدمت کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھوکے انسانوں کو سیر ہونا چاہیے۔ پھر خلق خدا کے تن کی خدمت کرنی چاہیے اور لوگ ننگے ہیں تو انہیں پوشاک مہیا ہونی چاہیے۔ انہیں گرمی اور سردی سے محفوظ ہونا چاہیے، اس لیے ان کے پاس رہنے کا ٹھکانا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انہیں آزادی فکر و عمل میسر نہیں ہے اور وہ انہیں آزادی ملنی

چاہیے۔ یہ وہ سب کچھ درست ہے اور خلق خدا کی خدمت ہے۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے: اس بات کا آخری نتیجہ کیا ہے؟ کیا بس یہی کہ ہم نے خلق خدا کی حاجتوں میں سے ایک حاجت پوری کر دی؟ اور ہمارا یہ عمل احسان اور بھلائی ہے، لیکن اگر خلق خدا خود اس حالت میں ہو کہ خود اپنی خدمت نہ کرے، لوگ خود اپنے دشمن ہوں، یعنی وہ نادانی اور جہالت سے ایسے کام کریں کہ خود اپنے بدترین دشمن بن گئے ہوں۔ گویا کہ انہوں نے اپنا راستہ اختیار کر رکھا ہو کہ نہ فقط یہ کہ وہ اپنی خوش بختی کے راستے پر نہ ہوں بلکہ اپنی اور عالم بشریت کی تباہی کے راستے پر چل رہے ہوں۔ اس صورت میں کیا ان سب باتوں کے باوجود ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہیں کہ خلق خدا کی خدمت کرنی چاہیے۔ ہمیں ان کے ہدف سے کیا غرض؟ ہمیں چاہیے کہ ان کے پیٹ کو سیر کریں۔ جب ان کا پیٹ بھر جائے تو وہ کس راستے پر چلتے ہیں، ان کا ہدف کیا ہوتا ہے اور اس وقت وہ کس راستے پر چل رہے ہیں، کیا ان چیزوں سے ہمیں کوئی مطلب نہیں؟ یا بات یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت اس شرط کے ساتھ ہونی چاہیے کہ وہ حقیقت میں ان کی انسانیت کی خدمت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی خدمت کے ذریعے انسانیت کی خدمت ہو، یعنی انسانی قدروں کی خدمت ہو اور خلق خدا کی خدمت ہو۔

یہ وہ طریقہ ہے کہ اس میں ایک انسانی قدر دوسری انسانی قدروں کے راستے پر چلتی ہے۔ اگر وہ دوسری انسانی قدروں کے راستے پر نہ چلے تو پھر خلق خدا کی خدمت کرنا ایک پیسہ بھر بھی قیمت نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے ایک بات کرنی چاہیے جو کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہ جب لوگ خلق خدا سے تعبیر کرتے ہیں تو ... کی خدمت

... حقیقت خدا کے تمام احکام، ایمان کی اصل اور تمام عبادتیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟ ہاں ہمیں چاہیے کہ ایمان رکھتے ہوں تاکہ ایمان کے ذریعے خلق خدا کی خدمت کریں، کیونکہ عبادت کے ذریعے خلق خدا کی بہتر خدمت کی جا سکتی ہے۔ تمام اسلامی احکامات اور بنی نوع انسان کے رہبروں کے تمام اقوال میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس چیز کی تمہید ہے کہ خلق خدا کی خدمت کی جائے، لیکن وہ یہ نہیں مانتے کہ خود خلق خدا بالآخر کیا بنتی ہے۔ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خلق خدا کی خدمت کی جائے تو آخر خود خلق خدا کیا ہدف رکھتی ہے اور کیا چاہتی ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ایمان اور عبادت خدمت خلق کی تمہید نہیں ہے، بلکہ خدمت خلق ایمان اور عبادت کی تمہید ہے۔ خدمت خلق عقلمند ہونے، عالم ہونے اور دوسری قدروں کو پانے کے لئے ... مخلوق کی خدمت کرنی چاہیے تاکہ ایمان، عبادت اور دوسری اعلیٰ قدریں ... لیکن خدمت خلق، ایمان کی تمہید اور بنیاد ہے اور ایمان کی تمہید ... ان دونوں میں سے کوئی بھی در اصل کسی دوسرے کی تمہید نہ ہو۔

اسلام کی نظر میں خدمت خلق ایمان کی تمہید ہے اور ایمان خدمت خلق کی تمہید نہیں ہے۔ اسلام کا مکتب یہی ہے اور وہ یہی بات کہتا ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو اس کا یہی مفہوم نکلتا ہے، لیکن اگر مکتب خدمت ... کی بات مانی جائے تو ہمیں انسانوں کی شناخت سے قطع نظر کرکے ہمیں مطمئن ہونا ہوگا۔ گویا کہ ہمیں ... اور ... کو ایک ہی سطح پر رکھ کر دیکھنا چاہیے ... دونوں انسان ہیں، دونوں پیٹ رکھتے ہیں، دونوں ... کے ... بھی ہوں۔ مکتب محبت ان دونوں میں کوئی فرق

رہ نہیں۔ بلکہ علم و عبادات کے مطابق وہ دونوں ایک ہی طرح کے جذبات رکھتے ہیں۔ ہم نے بعض صوفی کے مجاہدات دیکھے ہیں جو اسلامی عرفان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عرفاء کوئی معمولی درجے کے لوگ نہیں بلکہ انہوں نے بڑی ہی بلند باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے کیا کہا؟ آپ دیکھیے وہ عرفان آخر کار خدمت خلق کی طرف توجہ کرتا ہے لیکن عمل میں پیدا ہوتا ہے؟ عرفان آخر میں یا وسط میں نہیں بلکہ ابتدا ہی میں خدمت خلق کی طرف توجہ کرتا ہے یعنی خدمت خلق عرفان کی انتہا نہیں اور یہ اس کے ابتدائی کاموں میں سے ہے ہم اس مطلب کو اپنی تعبیر کے مطابق یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ہونا خدمت خلق کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ خدمت خلق خدا کے نزدیک ہونے کا وسیلہ ہے۔ پس مکتب محبت پر بھی دو اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ محبت کو انسانیت کی واحد قدر مانتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ محبت کو انسانیت کی انتہا تصور کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام ان دونوں نظریوں کو قبول نہیں کرتا۔ انسان اور اسلام محبت اور خدمت خلق کو قبول کرتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے لیکن یہ انسانی قدر ہے کہ جسے شروع ہی سے اختیار کرنا چاہیے نہ کہ یہ انسانیت کی سیر کا انتہائی مقام ہو۔ گویا کہ انسانیت کی سیر خدمت خلق سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اصل ہدف اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔

[illegible]

النصوص العربية

۱ وإذ ابتلى ابراهيم ربه بكلمات فأتمهن قال إني جاعلك
للناس اماما قال ومن ذريتي قال لا ينال عهدي الظالمين

۲ اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي .

۳ وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين ولا
يزيد الظالمين إلا خسارا

۴ قد أفلح من زكاها وقد خاب من دساها

۵ يوم ينفخ في الصور فتأتون أفواجا وفتحت السماء فكانت
أبوابا .

۶ والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل
الله فبشرهم بعذاب أليم . يوم يحمى عليها في نار جهنم
فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم . هذا ما كنزتم
لأنفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون .

۷ إنا خلقنا الإنسان من نطفة أمشاج نبتليه .

۸ فلما أسلما وتله للجبين

۹ ونادينه أن يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا

۱۰ إن إبراهيم كان أمة قانتا لله حنيفا ولم يك من المشركين

۱۱ قال إني جاعلك للناس إماما .

ليس البر أن تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من آمن بالله واليوم الآخر والملائكة والكتاب والنبيين وآتى المال على حبه ذوي القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل والسائلين وفي الرقاب وأقام الصلوة وآتى الزكوة

أيها الناس إنما الدنيا دار مجاز والآخرة دار قرار فخذوا من ممركم لمقركم ولا تهتكوا أستاركم عند من يعلم أسراركم وأخرجوا من الدنيا قلوبكم من قبل أن تخرج منها أبدانكم ففيها اختبرتم ولغيرها خلقتم

لن تقدس أمة لا يؤخذ للضعيف فيها حقه من القوي غير متتعتع

هجم بهم العلم على حقيقة البصيرة وباشروا روح اليقين واستلانوا ما استوعره المترفون وأنسوا بما استوحش منه الجاهلون وصحبوا الدنيا بأبدان أرواحها معلقة بالمحل الأعلى.

عجبا لابن النابغة يزعم لأهل الشام أن في دعابة وأني امرؤ تلعابة أعافس وأمارس لقد قال باطلا ونطق آثما

هو البكاء في المحراب ليلا

هو الضحاك إذا اشتد الضراب

إن مشية التبختر هي بغيضة إلا في مثل ذلك في الهيجاء سبحان ربي.

إن جمعت في صفاتك الأضداد

فلهذا عزت لك الأنداد

خلق يخجل النسيم من اللطف

وبأس يذوب منه الجماد

أحسب الناس أن يتركوا أن يقولوا آمنا وهم لا يفتنون

ملكتني عيني وأنا جالس فسنح لي رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقلت يا رسول الله ماذا لقيت من أمتك من الأود واللدد؟ فقال ادع عليهم فقلت أبدلني الله بهم خيرا منهم وأبدلهم بي شرا لهم مني.

دعوهن وأنهن صوائح تسمعها ونوح

وما كنت إلا كقارب ورد وطالب وجد

صرفت الفحص عن مكنون الأمر وأبى الله إلا إخفاءه

حبذا سبيل المجاهد في الله لا يعبد غير الواحد

ويوقظ الناس إلى المساجد

تهدمت والله أركان الهدى وانطمست أعلام التقى وانفصمت العروة الوثقى قتل ابن عم المصطفى قتل الوصي المجتبى قتل علي المرتضى قتله أشقى الأشقياء.

صديق كل امرئ عقله وعدوه جهله

إن هذه القلوب أوعية فخيرها أوعاها

اللهم بلى لا تخلو الأرض من قائم لله بحجة إما ظاهرا مشهورا وإما خائفا مغمورا لئلا تبطل حجج الله وبيناته

وكم ذا ومن أولئك، أولئك والله الأقلون عددا و
الأعظمون عند الله قدرا يحفظ الله بهم حججه وبيناته
حتى يودعوها نظراءهم ويزرعوها في قلوب أشباههم
هجم بهم العلم على حقيقة البصيرة

وباشروا روح اليقين واستلانوا ما استوعره المترفون،
وأنسوا بما استوحش منه الجاهلون

وصحبوا الدنيا بأبدان أرواحها معلقة بالمحل الأعلى

ألا بذكر الله تطمئن القلوب

فلعلك باخع نفسك على آثارهم إن لم يؤمنوا بهذا
الحديث أسفا.

طه ما أنزلنا عليك القرآن لتشقى إلا تذكرة لمن يخشى

لقد جاءكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم
حريص عليكم بالمؤمنين رءوف رحيم.

وما طلعت [illegible] قلوبهم مجموع
وعيونهم تدمع

ولو شئت لاهتديت الطريق إلى مصفى هذا العسل و
لباب هذا القمح ونسائج هذا القز ولكن هيهات أن
يغلبني هواي ويقودني جشعي.

ولعل بالحجاز أو اليمامة من لا طمع له في القرص ولا
عهد له بالشبع.

أو أبيت مبطانا وحولي بطون غرثى وأكباد حرى.

أأقنع من نفسي بأن يقال هذا أمير المؤمنين ولا أشاركهم
في مكاره الدهر

واستعينوا بالصبر والصلوة وإنها لكبيرة إلا على
الخاشعين.

من عرف نفسه فقد عرف ربه.

سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم
أنه الحق أولم يكف بربك أنه على كل شيء شهيد

لا يعرف [illegible]

الذين آمنوا وتطمئن قلوبهم بذكر الله ألا بذكر الله
تطمئن القلوب.

محمد رسول الله والذين معه أشداء على الكفار رحماء
بينهم تراهم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله ورضوانا
سيماهم في وجوههم من أثر السجود ذلك مثلهم في
التوراة ومثلهم في الإنجيل كزرع أخرج شطأه فآزره
فاستغلظ فاستوى على سوقه يعجب الزراع ليغيظ بهم
الكفار وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصالحات منهم
مغفرة وأجرا عظيما.

إن الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفا كأنهم
بنيان مرصوص.

سيماهم في وجوههم من أثر السجود ذلك مثلهم في
التوراة ومثلهم في الإنجيل كزرع أخرج شطأه.

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراكعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر والحافظون لحدود الله وبشر المؤمنين.

الصابرين والصادقين والقانتين والمنفقين والمستغفرين بالأسحار.

رهبان بالليل وليوث بالنهار.

كيف أصبحت قال أصبحت موقنا يا رسول الله.

ما علامة يقينك.

هو الذي أحزنني وأسهر ليلي وأظمأ هواجري

يا أيها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلوة إن الله مع الصابرين.

إن الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنكر.

روّوا السيوف من الدماء ترووا من الماء

فالموت في حياتكم مقهورين والحياة في موتكم قاهرين

اللهم إنك آنس الآنسين لأوليائك وأحضرهم بالكفاية للمتوكلين عليك

تشاهدهم في سرائرهم وتطلع عليهم في ضمائرهم

لن تنال شفاعتنا مستخفا بالصلوة.

فزت ورب الكعبة.

والله ما فجأني من الموت وارد كرهته ولا طالع أنكرته وما كنت إلا كقارب ورد وطالب وجد وما عند الله

خير للأبرار.

الله الله في الصلوة الله الله في الزكوة الله الله في الجهاد الله الله في الحج الله الله في بيت ربكم الله الله في جيرانكم.

هو الذي بعث في الأميين رسولا منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفي ضلال مبين.

صيرورة الإنسان عالما عقليا مضاهيا للعالم العيني.

ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله.

ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض.

إنه من يتق ويصبر فإن الله لا يضيع أجر المحسنين.

رب السجن أحب إلي مما يدعونني إليه وإلا تصرف عني كيدهن أصب إليهن.

من عرف نفسه فقد عرف ربه.

لا أرى الموت إلا سعادة والحيوة مع الظالمين إلا برما

وما الموت إلا قنطرة تعبر بكم.

والله لقد شغلني نور وجهه عن الفكرة في قتله.

لا تقتلوا الخوارج بعدي فليس من طلب الحق فأخطأه كمن طلب الباطل فأدركه.

السلام عليك يا أمير المؤمنين لقد عشت سعيدا ومت

سعيدا.

٧٨ه لأكلوا من فوقهم ومن تحت أرجلهم.

٧٩ه هو الذي بعث في الأميين رسولا منهم يتلوا عليهم آياته
ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من
قبل لفي ضلال مبين.

٨٠ه فسجد الملائكة كلهم أجمعون إلا إبليس استكبر و
كان من الكافرين.

٨١ه لقد خلقنا الإنسان في أحسن تقويم ثم رددناه أسفل
سافلين إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات.

٨٢ه ومن كان في هذه أعمى فهو في الآخرة أعمى وأضل
سبيلا.

٨٣ه قال رب لم حشرتني أعمى وقد كنت بصيرا قال كذلك
أتتك آياتنا فنسيتها وكذلك اليوم تنسى.

٨٤ه كلا إنهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون.

٨٥ه يتنسمون بدعائه روح التجاوز.

٨٦ه إن الله سبحانه وتعالى جعل الذكر جلاء للقلوب تسمع
به بعد الوقرة وتبصر به بعد العشوة وتنقاد به بعد
المعاندة وما برح لله عزت آلاؤه في البرهة بعد البرهة
وفي أزمان الفترات عباد ناجاهم في فكرهم وكلمهم
في ذات عقولهم.

٨٧ه ابتدع بقدرته الخلق ابتداعا واخترعهم على مشيته

اختراعا ثم سلك بهم طريق إرادته وبعثهم سبيل محبته

٨٨ه صيرورة الإنسان عالما عقليا مضاهيا للعالم العيني.

٨٩ه يا أيها الإنسان إنك كادح إلى ربك كدحا فملاقيه.

٩٠ه العبودية جوهرة كنهها الربوبية.

٩١ه قد أفلح من زكاها وقد خاب من دساها.

٩٢ه من أخلص لله أربعين يوما فجر الله ينابيع الحكمة من
قلبه على لسانه.

٩٣ه قل إن صلوتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين.

٩٤ه آتيناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علما.

٩٥ه لولا أن الشياطين يحومون حول قلوب بني آدم لنظروا
إلى ملكوت السموات.

٩٦ه لولا تمريغ في قلوبكم أو تزيدكم في الحديث لسمعتم
ما أسمع.

٩٧ه لولا تكثير في كلامكم وتمريغ في قلوبكم لرأيتم ما أرى
ولسمعتم ما أسمع.

٩٨ه ولقد سمعت رنة الشيطان حين نزل الوحي عليه صلى
الله عليه وآله فقلت يا رسول الله ما هذه الرنة؟ فقال:
هذا الشيطان قد أيس من عبادته إنك تسمع ما أسمع و
ترى ما أرى إلا أنك لست بنبي ولكنك لوزير وإنك لعلى
خير.

٩٩ه لصافحتهم الملائكة ولمشيتم على الماء.

إني لأجد ريح يوسف لولا أن تفندون.

قد أحيا عقله وأمات نفسه حتى دق جليله ولطف غليظه وبرق له لامع كثير البرق فأبان له الطريق وسلك به السبيل وتدافعته الأبواب إلى باب السلامة ودار الإقامة وثبتت رجلاه بطمأنينة بدنه في قرار الأمن والراحة بما استعمل قلبه وأرضى ربه.

أيكون لغيرك من الظهور ما ليس لك حتى يكون هو المظهر لك متى غبت حتى تحتاج إلى دليل يدل عليك ومتى بعدت حتى تكون الآثار هي التي توصل إليك عميت عين لا تراك عليها رقيبا.

ولا تدركه العيون بمشاهدة العيان ولكن رأته القلوب بحقائق الإيمان.

رهبان بالليل وليوث بالنهار.

التائبون العابدون الحامدون السائحون الراكعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنكر والحافظون لحدود الله وبشر المؤمنين.

ونفخت فيه من روحي فقعوا له ساجدين.

وفي أنفسكم أفلا تبصرون.

دواؤك فيك وما تبصر	وداؤك منك وما تشعر
وأنت الكتاب المبين الذي	بأحرفه يظهر المضمر
أتزعم أنك جرم صغير	وفيك انطوى العالم الأكبر

سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق.

الدنيا مزرعة الآخرة

الدنيا متجر أولياء الله

أيها الذام للدنيا المغتر بغرورها المخدوع بأباطيلها أتغتر بالدنيا ثم تذمها أنت المتجرم عليها أم هي المتجرمة عليك؟

ولقد خلقنا الإنسان من سلالة من طين.

ثم أنشأناه خلقا آخر.

ثم رددناه أسفل سافلين إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات.

فأما من ثقلت موازينه فهو في عيشة راضية وأما من خفت موازينه فأمه هاوية وما أدراك ما هيه نار حامية

فأما من طغى وآثر الحياة الدنيا فإن الجحيم هي المأوى وأما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فإن الجنة هي المأوى.

أعدى عدوك نفسك التي بين جنبيك.

قال بل سولت لكم أنفسكم أمرا فصبر جميل عسى الله أن يأتيني بهم جميعا إنه هو العليم الحكيم.

أفرأيت من اتخذ إلهه هواه.

وما أبرئ نفسي إن النفس لأمارة بالسوء.

١٢٢ مَرْحَبًا بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْأَصْغَرَ وَبَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ
الْأَكْبَرُ.

١٢٣ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولٰئِكَ
هُمُ الْفَاسِقُونَ.

١٢٤ قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ.

١٢٥ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ.

١٢٦ اُطْلُبُوا الْحَوَائِجَ بِعِزَّةِ الْأَنْفُسِ فَإِنَّ الْأُمُورَ تَجْرِي بِالْمَقَادِيرِ

١٢٧ اَلْمَوْتُ فِي حَيَاتِكُمْ مَقْهُورِينَ وَالْحَيَاةُ فِي مَوْتِكُمْ قَاهِرِينَ.

١٢٨ اَلْمَوْتُ فِي عِزٍّ خَيْرٌ مِنْ حَيَاةٍ فِي ذُلٍّ.

١٢٩ أَلَا وَإِنَّ الدَّعِيَّ ابْنَ الدَّعِيِّ قَدْ رَكَزَنِي بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَّةِ
وَالذِّلَّةِ وَهَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ يَأْبَى اللّٰهُ ذٰلِكَ لَنَا وَرَسُولُهُ
وَالْمُؤْمِنُونَ وَحُجُورٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ.

١٣٠ لَا وَاللّٰهِ لَا أُعْطِيكُمْ بِيَدِي إِعْطَاءَ الذَّلِيلِ وَلَا أَفِرُّ فِرَارَ
الْعَبِيدِ.

١٣١ إِنَّ الْحَيَاةَ عَقِيدَةٌ وَجِهَادٌ.

١٣٢ اَلْمَوْتُ خَيْرٌ مِنْ رُكُوبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ أَوْلٰى مِنْ دُخُولِ النَّارِ

١٣٣ فَمَنْ كَانَ بَاذِلًا فِينَا مُهْجَتَهُ مُوَطِّنًا عَلٰى لِقَاءِ اللّٰهِ نَفْسَهُ
فَلْيَرْحَلْ مَعَنَا فَإِنِّي رَاحِلٌ مُصْبِحًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ.

١٣٤ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا
أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللّٰهُ

يُحِبُّ الصَّابِرِينَ.

١٣٥ يَا كُمَيْلُ ابْنَ زِيَادٍ! مَعْرِفَةُ الْعِلْمِ دِينٌ يُدَانُ بِهِ بِهِ يَكْسِبُ
الْإِنْسَانُ الطَّاعَةَ فِي حَيَاتِهِ وَجَمِيلَ الْأُحْدُوثَةِ بَعْدَ وَفَاتِهِ
وَالْعِلْمُ حَاكِمٌ وَالْمَالُ مَحْكُومٌ عَلَيْهِ.

١٣٦ مَنْ عَلَّمَنِي حَرْفًا فَقَدْ صَيَّرَنِي عَبْدًا.

١٣٧ يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ.

١٣٨ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ
بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ.

١٣٩ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ.

١٤٠ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ.

١٤١ لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يَكُونَ بَخِيلًا وَلَا جَبَانًا.

١٤٢ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ.

١٤٣ اَلْمُؤْمِنُ نَفْسُهُ أَصْلَبُ مِنَ الصَّلْدِ.

١٤٤ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ فَوَّضَ إِلَى الْمُؤْمِنِ أُمُورَهُ كُلَّهَا وَلَمْ يُفَوِّضْ
إِلَيْهِ أَنْ يَكُونَ ذَلِيلًا أَمَا تَسْمَعُ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُولُ:
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ فَالْمُؤْمِنُ يَكُونُ عَزِيزًا
وَلَا يَكُونُ ذَلِيلًا إِنَّ الْمُؤْمِنَ أَعَزُّ مِنَ الْجَبَلِ الْجَبَلُ يُسْتَقَلُّ
مِنْهُ بِالْمَعَاوِلِ وَالْمُؤْمِنُ لَا يُسْتَقَلُّ مِنْ دِينِهِ شَيْءٌ.

١٤٥ فَوَاللّٰهِ مَا غُزِيَ قَوْمٌ قَطُّ فِي عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوا.

لا اله الا الله
محمد رسول الله

۴۶ لَا يَمْنَعُ الضَّيْمَ الذَّلِيْلُ وَلَا يُدْرَكُ الْحَقُّ اِلَّا بِالْجِدِّ.
۴۷ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ
غَيْرِ مَوْطِنٍ لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّةٌ لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهَا حَقُّهُ
مِنَ الْقَوِيِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ.
۴۸ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ
يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ
۴۹ اَشْجَعُ النَّاسِ مَنْ غَلَبَ هَوَاهُ.
۵۰ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.
۵۱ كُوْنَا لِلظَّالِمِ خَصْمًا وَلِلْمَظْلُوْمِ عَوْنًا.
۵۲ اَلْغِيْبَةُ جُهْدُ الْعَاجِزِ.
۵۳ مَا زَنٰى غَيُوْرٌ قَطُّ.
۵۴ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ.
۵۵ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا
اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا